جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کے حقوق

ریٹا منچندا

ترجمہ: ایم وسیم

مشعل

MashalBooks

جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کے حقوق

ریٹا منچندا

ترجمہ: ایم وسیم

مشعل بکس

آر-بی5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان

MashalBooks.org

جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کے حقوق

ریٹا منچندا

ترجمہ: ایم وسیم

کاپی رائٹ اردو ©2013 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی ©2009 ساؤتھ ایشیا فورم فار ہیومن رائٹس

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

پرنٹرز: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

قیمت: -/360 روپے

MashalBooks.org

فہرست

پیش لفظ 5

باب اول

شناخت کی سیاست 9

باب دوم

ریاست کا نظریہ اور مقصد 57

پاکستان 59

بنگلہ دیش 75

بھارت 83

بے دخلی کی زندہ مثالیں 109

بھارت 111

بنگلہ دیش 133

پاکستان 146

MashalBooks.org

MashalBooks.org

پیش لفظ

محمود ممدانی نے اپنی کتاب ''اچھا مسلمان، برا مسلمان'' میں لکھا ہے کہ موجودہ دور میں ثقافت کا معاملہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن کر ابھرا ہے۔ کوئی بھی شخص ''کسی غلط جگہ پر'' داڑھی رکھنے یا برقعہ اوڑھنے کی حماقت کر کے زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف عالمگیر جنگ کے موجودہ زمانے میں ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے جس میں اسلام کو تشدد اور عدم برداشت کا ماخذ اور مسلمانوں کو دہشت گرد کے طور پر پیش کرنے کا تصور دیا گیا ہے کے ساتھ دوبارہ نسل پرستی اور نفرت انگیزی نے پوری شدت سے مغرب کا رخ کر لیا ہے۔ مسلمان مردوں، بچوں اور بڑوں دونوں کو نسلی شناخت کی بنیاد پر دہشت گرد قرار دینے سے مسلمانوں کو اپنے ملکوں اور بیرون ملک ہر جگہ بالخصوص کثیر نسلی معاشروں میں بڑے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ مختلف نسلوں کے درمیان کھینچا تانی اور نسلی تشدد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جس کے وجہ سے بقائے باہمی کے لئے سماجی اور سیاسی گنجائش جبکہ کثیر الثقافت اور رواداری کے عناصر میں سکڑاؤ آیا ہے۔

جنوبی ایشیا دنیا کی بیشتر مسلم آبادی کا مسکن ہے۔ خطے کے 3 ملکوں بنگلہ دیش، مالدیپ اور پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ بھارت کی ایک ارب سے زائد آبادی کا 80 فیصد ہندو ہیں جبکہ اس وسیع و عریض ملک میں تقریباً 12 کروڑ مسلمان بھی ہیں۔ اگرچہ بھارت میں ہندو مسلم

تعلقات بمشکل مثالی بقائے باہمی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ دائیں بازو کی ہندو قوم پرست قوتوں کی سیاست میں مستحکم جگہ بننے سے لرزہ براندام بین النسل ہم آہنگی پر گہری چوٹ لگی ہے۔ دوسری طرف ہم بھارتی مسلمانوں کے اندر بھی انتہا پسند گروپوں کو ابھرتے دیکھ سکتے ہیں۔ بھارت میں بین النسل تعلقات مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کیونکہ بھارت کے اندر ہونے والے ''دہشت گردی'' کے تقریباً ہر واقعے میں ''پاکستانی ایجنسیوں'' اور مسلمانوں کی شرکت ''نظر'' آتی ہے۔ بھارت میں ایک طاقتور اور بااثر لابی یہ یقین رکھتی ہے کہ پاکستان ایک ''خودسر'' ریاست ہے جو'' دہشت گردی'' کو فروغ دے رہی ہے۔

نسل پرستی اور نفرت انگیزی دونوں دراصل عدم برداشت کی سیاست کا جڑواں اظہار ہیں۔ دائیں بازو کی سیاست ہر جگہ پر عدم برداشت کے کلچر کو فروغ دیتی ہے۔ پاکستان میں اس نے شیعہ سنی فرقہ وارانہ تشدد اور احمدیوں سمیت دیگر غیر مسلم برادریوں کے خلاف امتیازی سلوک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بنگلہ دیش میں اس کا ظہور ہندوؤں، بودھوں، عیسائیوں اور چٹا گانگ کی ترائیوں میں آباد مقامی قبیلوں کے خلاف امتیازی سلوک کی صورت میں ہوا ہے۔ سری لنکا میں سنہالی بودھوں کے احساس برتری نے تاملوں کے ساتھ بدسلوکی سے صرف نظر کر رکھا ہے جس سے مکالمے کے ذریعے مسئلے کے حل کا امکان تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح نیپال میں عدم برداشت کا کلچر پہاڑوں اور اس کی ترائیوں میں مقیم بڑی آبادی کے شہری حقوق سے انکار کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

دنیا کے کسی اور مقام کی طرح جنوبی ایشیا میں ''اقلیت'' ایک سیال شناخت کی حامل ہے۔ زبان، ثقافت، مذہب اور نسل اس کے عوامل ہیں ہی لیکن زیادہ اہم عوامل ''کمتری'' اور ''کمزوری'' کی کیفیت ہے۔ گزشتہ پانچ دہائیوں کی ریاست اور قوم بنانے کی تاریخ اس تاثر کو ثابت کرتی ہے کہ جمہوریتیں دراصل اقلیتوں کو جنم دیتی ہیں۔ قوم یا ریاست اکثریت پسند تصورات ہیں۔ یہ دونوں طاقت کو بھی تقویت پہنچاتی ہیں۔ طاقت کے اداروں تک رسائی یا ان پر کنٹرول، طاقتوں کے ماخذوں سے دوری اور رسائی سے انکار اکثریت اور اقلیت کے مابین فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

اس کتاب میں جنوبی ایشیا کے ممالک میں ''اقلیت'' کی حقیقت کی واضح تفصیل بتائی گئی ہے جہاں اس میں اقلیتوں کے تحفظ کیلئے کمزور آئینی اور قانونی فریم ورک کی نشاندہی کی گئی ہے وہاں نئی

MashalBooks.org

اقلیتوں کے جنم اور اقلیتوں کے اندر اقلیتوں کی صورتحال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں مقتدر اشرافیہ کے نام نہاد ''مقبول جذبات'' کے سامنے ارادتاً سرنگوں ہونے کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے جبکہ اقلیتوں کے تحفظ کے بین الاقوامی قانونی میکانزم انسانی حقوق کے معیارات اور عالمگیر اقدار کے سامنے اس اشرافیہ کی کمزوری کا بھی پردہ چاک کیا گیا ہے۔

اسی کتاب میں اقلیتوں کے حالات میں بہتری کیلئے کی جانے والی کوششوں اور خطے میں قدیم مقامی باشندوں کی صورتحال بالخصوص ''خودمختاری'' کے قوانین اور معاشرے میں وفاقیت سے متعلق اداروں کی مضبوطی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے اداروں نے جہاں یورپ میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ وہاں جنوبی ایشیا میں یہی ادارے کمزور اور غیر واضح کیوں ہیں۔ دراصل وفاقیت پر مبنی رویوں کے مطالبے کے خلاف یہاں شدید مزاحمت پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں یورپ میں قوم اور ریاست سازی کے عمل سے ''اقلیتوں'' کیلئے جغرافیائی پناہ گاہیں پیدا ہوئی ہیں وہاں جنوبی ایشیا میں نہ صرف مذہبی اقلیتیں مخصوص پناہ گاہوں میں مرتکز نہیں ہیں بلکہ خطے بھر کے ملکوں کے مختلف علاقوں میں منتشر ہیں۔ آدی واسیوں/ جناجاتیوں اور لسانی اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلے میں طاقت کی نچلی سطح تک حقیقی تقسیم اور خودمختاری کے ذریعے ممکنہ طور پر کامیابی ہوسکتی ہے لیکن اسے جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کے تحفظ کا ماڈل نہیں سمجھا جاسکتا۔ جنوبی ایشیا کو بقائے باہمی اور رواداری کے اپنے ماڈل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اس صورتحال میں واحد قابل اطمینان امر سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کے ایک حصے میں بڑھتی ہوئی یہ آگاہی ہے کہ اقلیتوں اور مقامی باشندوں کیلئے اختیارات کی تقسیم اور وفاق پسند سماج کی تخلیق امن اور استحکام کیلئے ناگزیر ہے۔ مؤخر الذکر کے حوالے سے ہم نے بنگلہ دیش، بھارت، نیپال، پاکستان اور سری لنکا کی ''مرکزی دھارے'' کی آبادی کے اندر جدوجہد کرتی اقلیتوں کیلئے ہمدردی اور حمایت میں اضافے کا مشاہدہ کیا ہے۔ جنوبی سری لنکا میں امن کی آواز ملک میں وفاق پسند نظام حکومت کے مطالبے کی حامی نظر آتی ہے۔ یہ شمالی اور مشرقی سری لنکا میں تاملوں کی خودمختاری کے حق کی حمایت کرتی ہے۔ نیپال اور بنگلہ دیش میں ایسی آوازیں موجود ہیں جو کہتی ہیں کہ آدی واسیوں اور جناجاتیوں کو ریاستی امور میں ان کا جائز حق ملنا چاہیئے۔ بھارت میں

MashalBooks.org

شہری، سیاسی، ماحولیاتی اور خواتین کے حقوق کی تحریکیں بھی اقلیتوں، آدی واسیوں اور قبائلیوں کے حقوق کی جدوجہد میں ان کی ہمرکاب ہیں۔ بھارت کی عام آبادی بھی گزشتہ عام انتخابات میں دائیں بازو کی جماعتوں کو مسترد کر کے مذہبی لسانی تشدد کے خلاف بنیادی مزاحمت کے طور پر ابھری ہے ہم اس کتاب کو اس خطے میں انسانی حقوق کے محافظوں سے منسوب کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی اور سیاسی حقوق کے کارکنوں اور طلبا کیلئے ممدومعاون ثابت ہوگی۔

تپن کمار بوس

کھٹمنڈو، ستمبر 2006

MashalBooks.org

باب اول

شناخت کی سیاست

اقلیتوں اور اکثریت کے حقوق کی تشریح:۔

کسی اقلیت کو تسلیم کرنا اقلیتی حقوق کے تحفظ کی سمت میں ایک اہم شرط ہے۔ بین الاقوامی کنونشن، اعلامیے اور ادارہ جاتی میکانزم اقلیتی حقوق اور ضرورتوں کی فراہمی کے لئے فریم ورک مہیا کرتے ہیں۔ تاہم اس بات کی کوئی متفقہ بین الاقوامی تعریف موجود نہیں کہ کون سا فرد یا گروپ ان حقوق کا حامل ہے؟۔ جنوبی ایشیا کی مختلف ریاستیں اس بات کی مختلف تشریح کرتی ہیں کہ کوئی اقلیت کیسے معرض وجود میں آتی ہے۔ پاکستان صرف مذہبی اقلیتوں کو تسلیم کرتا ہے اور سندھی، بلوچ، پشتو، قومیتوں یا نئی مذہبی اقلیت احمدیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ بنگلہ دیش آئینی طور پر یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ملک میں کوئی لسانی، مذہبی یا نسلی اقلیتیں موجود ہیں۔ سری لنکا کی اقلیتوں کے حقوق کا معاملہ نسلی طور پر اتنا منقسم ہے کہ ماضی قریب تک میں بھی تیسری برادری مسلمان اس خلا سے نکل گئی۔ اس کے علاوہ سماجی (محروم ذات) اقلیتوں یا مقامی گروہوں کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے تو وہ دلتوں کو اقلیت تسلیم نہیں کرتا اور ریاستی ادارے یک نسلی ہندو شناخت کو جائز قرار دینے کا رجحان رکھتے ہیں جس سے مذہبی اقلیت کی کیٹیگری سے کئی مذہبی فرقے خارج ہو جاتے ہیں۔ آئینی لحاظ سے وہاں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی ثقافتی کیٹیگری میں بناؤٹ نظر آتی ہے جبکہ اقتدار اور سیاست میں نمائندگی کے پہلو سے گریز دکھائی دیتا ہے۔ اپریل 2006 میں انقلاب سے قبل نیپال اپنے کثیر المذہبی کردار سے انکار کرتا تھا اور لسانی اور اس نے نسلی اقلیتوں کو

نظر انداز کرنے کو ادارہ جاتی حیثیت دی۔ بھوٹان اپنی کثیر نسلی آبادی کو ایک ''قوم'' ایک عوام پر مشتمل ریاست بنانے کا خواہاں ہے۔

جنوبی ایشیا کے کسی ملک میں مقامی قدیم باشندوں (Indigenous Population) کتاب میں آگے اصل باشندے کی اصطلاح انہی لوگوں کیلئے استعمال کی گئی ہے۔ مترجم) کی موجودگی باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کی جاتی۔ اقلیتی یا مقامی آبادیاں یا لوگ ایسے تصورات ہیں جو منقسم مگر امتیاز اور بے اختیاری کے مشترکہ تناظر سے باہم منسلک ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تحت شناخت تسلیم کرنے کا عمل حقوق اور مطالبات ریاستی ذمہ داری کے زمرے میں آتے ہیں۔

اقوام متحدہ اقلیت کی تعریف پر متفق ہونے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکی۔ درست تعریف کی عدم موجودگی کے بھی اپنے فوائد ہیں لیکن یہ کئی سماجی تاریخی دھڑے بندیوں کو شناخت دینے سے پہلوتہی کا بھی باعث ہے۔ بین الاقوامی قانون میں یہ درجہ بندیاں کئی قسم کے حقوق سے منسلک ہیں۔ ان میں حق خودارادیت بھی شامل ہے جو ایک اقلیت کو میسر نہیں ہے۔ قوم۔ ریاست کے فریم ورک کو تصوراتی شکل دینے کا عمل قانونی پیچیدگیوں کا شکار ہے جو ایک ایسی متصادم صورتحال کا شاخسانہ ہے جس میں اقلیتوں کے تحفظ کا لبرل ایجنڈا ایک ثقافتی شناخت کے ذریعے کسی قوم کو جوڑنے کے سیاسی پراجیکٹ کے ساتھ بمشکل اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا تاریخی ارتقا

ایسی تحریکیں جو نسلی تفریق کو ابھارتی رہی ہیں دنیا کی جغرافیائی تبدیلیوں کا جزو لازم ہیں۔ البتہ سترھویں صدی میں حد بندی پر مشتمل ریاست وجود میں آنے اور یہ تصور کہ ایک سیاسی معاشرہ مخصوص علاقے کا ''مالک'' ہونا چاہیئے اور یہ حق ملکیت اس علاقے میں موجود افراد کے قانونی حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کا اختیار دیتا ہے کہ بعد ملکیت اور کنٹرول کے سوالات اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ انیسویں صدی اور آزادی کا دور آنے کے بعد پرانی سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں تو قوم پرستی اور ری پبلکن ازم کے نظریے کو ایک قوم اور ایک لوگ کے سیاسی ڈھانچے سے جوڑ دیا گیا لیکن یہ قومی ریاست ہم نسل (Homogenous) نہیں تھی۔ اس کی حدود میں اکثر مختلف قومیت، نسل، زبان اور مذہب کے حامل عددی طور پر چھوٹے افراد بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ دراصل ایسی

اقلیتیں تھیں جن کے اپنے ''آبائی وطن'' کی تاریخ تھی اور وہ کسی اور معاشرے میں جذب نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس کے علاوہ عملی جمہوریت کی روایات نے جنم لیا جس سے ''مستقل'' اقلیتوں اور اکثریتوں کا وجود سامنے آیا۔

تاریخی اعتبار سے ریاست کے اندر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکامی کا نتیجہ بڑے اندرونی اور بین الاقوامی تنازعات کی صورت میں نکلا۔ اس طرح بین الاقوامی تشویش میں اضافہ ہوا اور تیزی سے ابھرتے ہوئے ''بچانے کی ذمہ داری'' کا نظریہ خودمختار ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے اصولوں سے تصادم کی راہ پر گامزن ہونے لگا۔ جنگ عظیم اول کے بعد کا سیاسی نظام اور وسطی یورپ کے بلقانی خطے میں تبدیلی کے باعث مفتوحہ علاقوں میں اقلیتوں سے متعلق معاہدوں کا ڈھانچہ تیار ہو گیا لیکن یہ عمومی بین الاقوامی معیارات کی تشکیل نہیں تھی۔ لیگ آف نیشنز ان معاہدوں کی ضمانت تھی اور جیسے ہی یہ ادارہ ختم ہوا تو تمام معاہدے بھی اپنی موت آپ مر گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور کے بین الاقوامی نظام میں ''لسانی'' بنیاد پر ہم نسلی کا معاملہ وجہ تنازع بن چکا تھا اور خاص قوم پرستی کے نظریات اپنی وقعت کھونے لگے۔ سرد جنگ سے مغلوب نظام مختلف ریاستوں کے انہدام اور نوآبادیاتی ڈھانچوں کی آزادی جو لسانی گروپوں کے اتحاد کی تحریکوں کے زیر اثر تھی سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ اقوام متحدہ کے ضابطہ ہائے کار میں مخصوص حقوق کی بجائے عالمگیر تحفظ کے اصول پر زور دیا گیا۔ اقوام متحدہ کا چارٹر اقلیتوں کے بارے میں بالکل خاموش ہے اور صرف مساویانہ حقوق کی فراہمی کی بات کرتا ہے۔ انسانی حقوق کے عالمگیر ڈیکلریشن میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ یہ مساوات اور لوگوں سے بلا امتیاز برتاؤ پر زور دیتا ہے۔ کئی ریاستوں نے اقلیتوں کے مسائل پر غور کرنے اور اقوام متحدہ اور علاقائی حکومتی اداروں کی کوششوں کو اپنا اندرونی معاملہ قرار دے کر روک دیا اور ایسا 1960 تک ہوتا رہا۔ اس کے بعد شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی علامیے میں اقلیتوں کے مخصوص حقوق کا حوالہ دیا گیا (آرٹیکل 27) جس کے تحت اقلیتیں بھی کسی کمیونٹی کے دیگر گروپوں کے ساتھ اپنے ثقافتی، مذہبی اور لسانی حقوق حاصل کر سکتی ہیں۔

1990 کے عشرے تک اقوام متحدہ کے اقلیتوں پر ذیلی کمیشن نے ناقابل ذکر پیشرفت کی۔

MashalBooks.org

البتہ قومیت، زبان، نسل اور مذہب کی بنیاد پر اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کیلئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک ڈیکلریشن کی منظوری دی (1992)۔ اس میں یورپ کے پرانے مسئلے یعنی پرتشدد لسانی تنازعات کے دوبارہ سر اٹھانے پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ یہ ڈیکلریشن اگرچہ کسی کو لازماً عملدرآمد کرنے کا پابند نہیں کرتا لیکن اس میں پہلی بار کسی بین الاقوامی دستاویز میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کی گئی اور اس طرح اخلاقی طور پر یہ بہت بڑا جواز رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اقوام متحدہ کی طرف سے امتیازی سلوک روکنے کی محدود کوششوں سے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے سیاسی کردار کے زیادہ وسیع اور متحرک دائرہ کار کی طرف پیشقدمی کی گئی ہے۔ نسلی تشدد اور اصل باشندوں کی جدوجہد کے حوالے سے نئی فکر میں عوامی امور میں اقلیتوں کی شرکت کے حق کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

بین الاقوامی سطح پر مختلف اقسام کے میکانزم کی تیاری میں پیشرفت کے متوازی طور پر یوگوسلاویہ میں نسلی تصادم اور اس سے منسلک نسلی تنازعات نے یورپی اقوام کو تصادم سے بچاؤ کی پیشگی حکمت عملی تیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ کانفرنس برائے سلامتی و تعاون یورپ (جسے بعد ازاں او ایس سی ای کا نام دیا گیا) اور کونسل آف یورپ نے میکانزم کی تیاری میں بازی لے گئیں۔ اس میکانزم میں فریم ورک فار پروٹیکشن آف نیشنل مینارٹیز (1995) شامل تھا جس کا زیادہ تر مقصد مشرقی اور سطحی یورپ میں ''قومی'' اقلیتوں کا تحفظ کرنا تھا۔ مختلف ملکوں میں اقدامات کرنے کے اختیارات کے حامل ہائی کمشنر برائے قومی اقلیت کا تقرر عمل میں لایا گیا۔

مغربی یورپ کی کچھ حکومتوں نے اپنے ملکوں میں اقلیتوں کے تحفظ کے ان نئے اقدامات کی مخالفت جاری رکھی۔ اس معاملے کا مرکزی جزو ریاستی امور میں مداخلت کے بارے میں بعض ممالک کی حساسیت اور علاقائی سالمیت اور عوام کا حق خودمختاری تھا۔ علاقائی سطح پر کونسل آف یورپ اور OSCE نے اس تصادم کو اقلیتوں کی خواہشات سے نمٹنے کیلئے خودمختاری اور وفاقی ڈھانچے کے نکتے سے حل کرنے کی کوشش کی تاہم چونکہ خودمختاری کے تصور کی قانوناً تشریح نہیں کی گئی لہٰذا ہر کیس میں اس کی نئی شکل سامنے آنے لگی۔

موجودہ دور تو جمہوریت انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کا عرصہ قرار دے کر سراہا گیا ہے لیکن نام نہاد ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں حقوق کو کچلا جا رہا ہے۔ اس جنگ سے

MashalBooks.org

نفرت انگیزی اور نسل پرستانہ سوچ عود کر آئی ہے جس سے قانون کی حکمرانی شدید متاثر ہوتی ہے۔ مختلف ریاستوں نے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے تناظر میں اقلیتوں کے سیاسی کردار سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کے خلاف جنگ نے انسانی بنیادوں پر جارحانہ مداخلت کے نظریات کو بھی جنم دیا۔ امریکی قیادت میں مداخلت کے بین الاقوامی نظام نے اقوام متحدہ کے نیک ارادوں پر سوالیہ نشانات لگا دیے۔ جیسا کہ قتل عام، جنگی جرائم، نسلی صفائی اور انسانیت کے خلاف جرائم سے انسانوں کے بچاؤ کی ذمہ داری کا اقوام متحدہ کا 2005 کا ڈیکلریشن ہے۔

مثبت اقدامات کا ذکر کریں تو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی جگہ انسانی حقوق کونسل کا قیام ہے جس کی منظوری جنرل اسمبلی نے دی۔ انسانی حقوق کمیشن اکنامک اینڈ سوشل کونسل کا ذیلی ادارہ تھا۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ میں 2 نئے عہدے بھی تخلیق کئے گئے۔ ان میں قتل عام سے بچاؤ پر سیکرٹری جنرل کے خصوصی مشیر کا تقرر اور دوسرا 2005 میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کی طرف سے خود مختار ماہر کا تقرر جو اقلیتوں کے امور پر گہری نظر رکھتا ہے۔

اقلیت کی قابل عمل تعریف:۔

غالباً ''اقلیت'' کی سب سے قابل قبول اور جامع نظریاتی تعریف اقلیتوں کے خلاف امتیازی سلوک روکنے کیلئے اقوام متحدہ کے ذیلی کمیشن کے خصوصی نمائندے فرانسسکو کاپوٹورٹی (Francesco Capotorti) نے کی ہے۔ شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی قاعدے کے آرٹیکل 27 کے تحت ایک اقلیتی گروہ وہ ہے۔

''وہ گروپ جو کسی ریاست کی دیگر تمام آبادی کے مقابلے میں عددی طور پر چھوٹا اور کمتر پوزیشن میں ہو جس کے ارکان دیگر آبادی کی بہ نسبت مختلف نسلی، مذہبی اور لسانی شناخت کے حامل ہوں اور جو اپنی ثقافت، روایات، مذہب یا زبان کے تحفظ کے لئے ایک گونہ احساس یکجہتی رکھتے ہیں''۔

فرانسسکو کاپوٹورٹی نے کسی گروہ کو اقلیت قرار دینے کا ایک خاص خارجی اور نفسی معیار وضع کیا ہے۔ خارجی معیار بتاتا ہے کہ کسی اقلیت کو نہ صرف عددی طور پر کم ہونا چاہیئے بلکہ وہ ان کی

MashalBooks.org

حیثیت بھی کم تر ہونی چاہیئے ۔ جبکہ نفسی معیار یہ بتاتا ہے کہ ایسا گروپ اپنی ثقافت ، روایات ، مذہب یا زبان کے تحفظ کیلئے ایک ایک گونہ احساس یکجہتی بھی رکھتا ہو۔

کھٹمنڈو میں 1998 میں SAFHR کے زیر اہتمام اقلیتوں کے حقوق پر ایک وسیع النظر مباحثہ ہوا۔ جس میں جنوبی ایشیا والوں نے محسوس کیا کہ یہ تعریف جامع نہیں کیونکہ اس میں وہ گروہ شامل نہیں جو اپنی تعریف کی بنیاد محفوظ نہیں کرنا چاہتے ، مثلاً دلت (جنوبی ایشیا کی اچھوت ، محروم ذات) جن کی شناخت برتر ذاتوں نے مسلط کی ہے اور انہیں غیر مطلوب اور غیر اہم قرار دیا گیا۔ مباحثے میں جنوبی ایشیا کے بعض شرکا کا پوٹورٹی کے کولیگ جولیس ڈی شینی کی تعریف کے زیادہ معترف تھے جنہوں نے اپنی تعریف میں اقلیتوں کی اپنی شناخت کے تحفظ کیلئے کوششوں کی جگہ ان کی اپنی اور اکثریت کے برابر مساوات کی اجتماعی خواہش کا ذکر کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذیلی کمیشن نے 1985-86 کی اپنی قرارداد میں بھی ڈی شینی کی اقلیتوں سے متعلق تعریف استعمال کی۔

''شہریوں کا ایک ایسا گروہ جو کسی ریاست میں عددی اور حیثیت کے لحاظ سے کمتر ہو۔ جس کی لسانی ، مذہبی اور نسلی شناخت باقیماندہ اکثریت سے مختلف ہو۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ یکجہتی کا احساس رکھتے ہوں۔ وہ حقیقت میں اور قانون کے تحت اکثریت کے برابر حقوق اور اپنی بقا کی اجتماعی خواہش رکھتے ہوں''۔

اگرچہ جہاں مرکزی دھارے میں جذب یا شامل ہونے کی خواہش سے متعلق دلائل کا اطلاق ان نسلی اقلیتوں پر ہوتا ہے جو زیادہ تر تارکین وطن پر مشتمل ہیں یا پھر یہ دلائل بھارت میں اچھوتوں جیسی سماجی اقلیتوں سے متعلق ہیں لیکن ان کا اطلاق قومیتی یا لسانی اقلیتوں پر نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ ان اقلیتوں کی طرف سے اپنی شناخت کے تحفظ کی خواہش ہے جنہیں اکثریت مشکوک انداز میں دیکھتی ہے۔

اسی طرح ''اکثریت'' کے بطور عددی تصور کی بھی چھان بین کی گئی ہے کیونکہ بعض صورتوں میں اکثریت بھی کمتر پوزیشن میں ہوسکتی ہے۔ محروم اور مطعون ہوسکتی ہے۔ (جیسا کہ جنوبی بھوٹان کی لہوٹسمپا آبادی ہے) یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ عددی طور پر کم گروہ ماتحت پوزیشن میں ہوں (جیسا کہ بھوٹان کا ڈرکپا نا گالونگ قبیلہ) یا پھر پسماندہ یا مواقع تک نسبتاً کم رسائی رکھنے والا گروہ (مثلاً نیپال کے نیواڑی یا پاکستان بننے کے بعد بطور مہاجر آباد ہونے والے لوگ) سری لنکا کی نسلی

تعلقات پر مبنی سیاست اکثریت، اقلیت تقسیم کو غیر منطقی انداز میں مسترد کرتی ہے۔ سنہالی اکثریت کو اقلیتی احساس کمتری کا سامنا ہے جبکہ تامل اقلیت کے عزائم اکثریتی آبادی جیسے ہیں، کشمیر کے معاملے میں وہاں کی اکثریتی آبادی کو بھارتی یونین میں اقلیت جیسی صورتحال کا سامنا ہے۔

اکثریتی۔اقلیتی گروپوں اور اکثریتی، اقلیتی شناخت کی تشکیل کی تہہ میں طاقت کے حصول کی سوچ نظر آتی ہے۔ اختیارات کی ازسرنو تقسیم کا مسئلہ بالخصوص ریاست اور قومی اقلیتوں کے درمیان تعلقات کی اعلیٰ ترین سطح پر پایا جاتا ہے۔ ایک اہم معیار خودشناختی کا بھی ہے۔ ایک اکثریت یا اس گروپ کا یہ حق کہ وہ تعین کرے کہ کون اقلیت کا فرد ہے۔ کئی گروپ مثال کے طور پر سری لنکا کے تامل باشندے، شمال مشرقی بھارت کے ناگا قبائل اور بنگلہ دیش کی چٹا گانگ کی ترائیوں میں مقیم قدیم باشندے (اور ان کی ذیلی شاخیں) خود کو ایک اقلیت نہیں سمجھتے بلکہ اپنی پہچان ''قوم'' کے طور پر کرانا چاہتے ہیں۔ ان اقلیتوں میں سے کوئی بھی خود کو نسلی گروہ نہیں سمجھتا۔ ہر کوئی الگ قوم ہونے کا دعویدار ہے۔ تاملوں، ناگا قبائل اور چٹا گانگ کی پہاڑی ترائیوں کے باشندوں کی جدوجہد کی تاریخ بتاتی ہے کہ کس طرح ایک تاریخی موقع پر ایک گروپ اقلیت کے طور پر شناخت قبول کرنے سے انکار کر کے قوم کا درجہ حاصل کرنے کا دعویدار بن جاتا ہے۔

لوگوں کے حق خودارادیت کا دعویٰ

لوگ کس طرح سے بنتے ہیں؟ اس پر بین الاقوامی قانون خاموش ہے۔ عملی طور پر ثقافت، زبان، نظریہ، مذہب اور علاقہ کسی گروپ کے بطور لوگ وجود میں آنے کیلئے استعمال ہوتے ہیں تاہم ان خواص کے حامل گروپوں کی بڑی تعداد شاید اب بھی لوگ یا عوام نہیں قرار دی جاسکتی۔ عوام کو ظاہر کرنے کے ناگزیر عناصر طبعی خواص کے حامل نہیں بلکہ نظریاتی اور تاریخی شناخت پر مشتمل ہیں۔ کوئی بھی ''لوگ'' اس وقت وجود میں آتے ہیں جب انہیں اپنی شناخت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی بقا کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ لوگوں کی تشکیل کا معاملہ ایک سیاسی مظہر ہے۔ لوگوں کا حق خودارادیت سیاست پر مبنی ہوتا ہے اور اس امر کی عملی تصویر سیاسی ہوتی ہے۔

بین الاقوامی قانون کے تحت لوگوں اور اقلیتوں کے حقوق مختلف ہوتے ہیں۔ سالمیت کی عدم موجودگی میں لوگ ایک ''قوم'' ہوتے ہیں۔ لوگوں کے خودارادیت کے حق کا اصول جنگ عظیم

MashalBooks.org

اول کے بعد امریکی صدر ووڈرو ولسن کی امن تجاویز میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں بھی یہ سامنے آیا۔ یوں نوآبادیاتی نظام کی تحلیل کے تناظر میں اسے پختگی مل گئی۔ اقلیتوں کے پاس حق خودارادیت نہیں ہوتا۔ اس میں مزید ابہام اس وقت جنم لیتا ہے جب لوگوں یا لوگوں کے گروپوں کو غلطی سے اقلیتوں کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یہ گروہ (قومی اقلیت) ایک ایسے علاقے میں مقیم ہوتا ہے جہاں وہ لوگوں کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں اقلیتی گروپ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس طرح لسانی گروہ خود کو اقلیت کی بجائے لوگ People قرار دے سکتا ہے۔ سری لنکا کے تاملوں کے معاملے میں اقلیتی شناخت سے منسلک ماتحت مقام یہ ثابت کرنے کیلئے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ تامل لوگ کوئی قوم بناتے ہیں۔

اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حقوق انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بیشتر کیسوں میں وہ بطور گروپ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق اجتماعی حقوق ہوتے ہیں۔ کسی لسانی یا قومیتی گروپ سے تعلق رکھنے والے افراد بطور اقلیت کے حوالے سے انفرادی حقوق کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور جب وہ گروپ کے طور پر کام کر رہے ہوتے ہیں تو لوگوں کے حق خودارادیت کی بنیاد پر اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

مقامی باشندوں کو اقلیتوں سے الگ شناخت کرنا

کسی علاقے کے اصل یا مقامی باشندے جنہیں بیشتر مقامات پر ''مقامی آبادی'' اور ''مقامی قومیت'' سمجھا جاتا ہے وہ تصوراتی طور پر نسلی، مذہبی، زبان یا قومیت کے لحاظ سے پہچانے جاتے ہیں جبکہ عملی طور پر ان کیٹیگریوں کو ان کے اختیارات سے محرومی، امتیازی سلوک اور پسماندگی کے عمومی تجربے کی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ موجودہ بین الاقوامی قاعدوں اور معیارات کے تحت اقلیتوں کو فرد کے حقوق کا حقدار قرار دیا جاتا ہے۔ مقامی حقوق انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے ہوتے ہیں جس میں مؤخرالذکر زیادہ متعلقہ ہے۔ روایتی علاقوں یا زمینوں میں اقلیتوں کے حقوق بین الاقوامی (یا قومی) قانون میں انہی علاقوں میں مقامی باشندوں کے حقوق سے کہیں زیادہ کمزور ہوتے ہیں۔

یہ دراصل اقلیت کے حقوق اور ان سے امتیازی سلوک پر اظہار خیال ہی تھا جس کی وجہ سے

MashalBooks.org

مقامی باشندوں کو اقوام متحدہ کے ایجنڈے میں جگہ ملی۔ نوآبادیاتی نظام کی تحلیل کے معاملے پر جس طرح لب کشائی کی گئی اس سے مقامی لوگوں کے حقوق کی شناخت کے امکانات پہلے ہی ختم ہوگئے۔ ''بلیو واٹرز'' یا ''سالٹ واٹرز'' میں مقیم نوآبادیاتی نظام'' کے نظریے کی بالادستی نے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور خودارادیت کو صرف سمندر یا خطوں تک محدود کردیا۔ وہ یوں کہ نو آبادیاتی علاقے پانی کی بڑی مقدار یعنی سمندر کے ذریعے سامراجی ریاست سے الگ کردیے گئے۔ اس سے ان علاقوں میں اپنی زندگی گزارنے یا وسائل استعمال کرنے کے مقامی لوگوں کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا گیا۔ نوآبادیاتی معنوں میں تمام غیر مقامی اور غیر یورپی آبادی کو ''مقامی'' یا اصل باشندے قرار دیا گیا۔ اس طرح کئی لوگوں کے نزدیک نوآبادیاتی نظام کی رسمی تحلیل کا مطلب ایک جارح کا انتظام دوسرے جارح کے حوالے کرنا تھا۔

اصل باشندوں (Indigenous) کی بین الاقوامی سطح پر کوئی قابل قبول تعریف نہیں۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی تنظیمیں قرار دیتی ہیں کہ اصل باشندوں کو اپنی تعریف (Definition) اور اپنی روایات کے مطابق ممبرشپ کرنے کا حق حاصل ہے۔ مثال کے طور پر انٹرنیشنل لیبر آرگنائز یشن (آئی ایل او) اور ورلڈ بنک کا کہنا ہے کہ کسی کو اصل باشندہ یا قبائلی کی تعریف میں لانے کیلئے ''اصل باشندے'' اور ''قبائلی'' کے طور پر اپنی تعریف کرنا بنیادی معیار ہے۔

اصل باشندے کے نظریے یا موجودہ تصور اور جنوبی یورپ کے حکومتی ڈھانچے کو ڈھالنے میں مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے ماہرین اور کارکنوں کے درمیان مکالمے کا بڑا ہاتھ ہے۔ جنہوں نے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر اس تصور کی حمایت کی چنانچہ اس تصور کی جڑیں نوآبادیاتی پس منظر کی حامل ہیں۔ جب اس کا اطلاق برائے اعظم ہائے امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لوگوں پر کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی ابہام نظر نہیں آتا لیکن جب اس نظریے کو ایشیا یا افریقہ کیلئے استعمال کیا جائے تو ابہام جنم لیتا ہے۔ ایشیائی خطے کی حکومتوں نے اقوام متحدہ کی تعریف میں پائے جانے والے اسی ابہام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لاکھوں قبائلی افراد (افریقہ، ایشیا) کو اصل باشندوں کے مرتبے سے نکال باہر کیا۔ اصل باشندوں کے بارے میں یہ نام نہاد تصوراتی بحث اور یہ کہ کیا یہ نوآبادیاتی نظام کے بعد کی ایشیائی ریاستوں پر قابل اطلاق یہ بحث بے نتیجہ رہے گی۔ کوئی بھی تصور کسی حقیقت کی مکمل طور تعریف نہیں کرسکتا۔ ریسرچر اور قبائلی حقوق کے ممتاز فلمساز تاپن بوس کہتے

MashalBooks.org

ہیں کہ

.....ایشیا کے قبائلی افراد کو بیدخل کرنے کی اصل وجہ تصوراتی ابہام نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ اس لئے یہ ایک سیاسی بحث ہے، جس میں موجودہ قومی اور بین الاقوامی طاقت کے ڈھانچے میں قبائلیوں کی اپنی بے اختیاری اور حصول انصاف اور عدم توازن کے خاتمے کے لئے جدوجہد کی حقیقت پہ توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

بلاشبہ تعریف پر اتفاق رائے کی کمی سے غیر سرکاری اور نیم سرکاری تنظیموں کی مقامی لوگوں کے بارے میں تشویش کو ادارہ جاتی شکل دینے کی جدوجہد میں ابہام نہیں ہونا چاہیئے اور اسے انسانی حقوق کی بین الاقوامی بحث میں جگہ دینی چاہیئے۔

آئینی ضمانتیں یا اعتماد کا معاملہ

بین الاقوامی سطح پر اقلیت کے تصور پر بامعنی تعریف کی عدم موجودگی میں یہ ہر ریاست کی اپنی مرضی ہوتی ہے کہ وہ افراد کے مختلف گروہوں کو اقلیتی تسلیم کر کے انہیں ان کے حقوق دے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہین نشین رکھنی چاہیئے کہ یہ کوئی قومی ''مادر ریاست'' نہیں ہوتی جو اقلیتی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتی بلکہ ایسی ریاست ہوتی ہے جو اکثریت کی حمایت سے وجود میں آتی ہے اور اکثر ریاست کی طرف سے اقلیتی حقوق کے تحفظ اور سیاسی استحکام کے اشتراک کار کے ربط پر مبنی ہوتی ہے۔ بھارت کے معاملے میں یہ امر آئینی فریم ورک جس میں صرف اقلیتوں کو جمہوری عمل میں اور انصاف یا برابری تک رسائی پر مشتمل حقوق دینے کی بجائے محض اقلیتوں کے تحفظ پر زور دیا جاتا ہے کے طریقہ کار پر مشتمل ہوتا ہے۔

بھارت کے آئین سازوں نے سیاست کے شعبے کو ''برابر'' انفرادی شہریوں کا حق سمجھا جہاں کمیونٹیز اور خصوصی حقوق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وہ طرز عمل تھا جس کے تحت بھارت کی آئین ساز اسمبلی نے اقلیتوں کے حوالے سے سیاسی تحفظات کو بالائے طاق رکھنے کا جواز فراہم کیا۔ بھارتی آئین اور دلتوں کی ترقی کی جدید تحریک کے بانی بی آر امبید کر نے بھی 1949 میں آئین ساز اسمبلی میں بحث کے دوران کہا تھا کہ ''وہ (اقلیتی لوگ) اپنے تحفظ کا راستہ انہی لوگوں کے درمیان رہ کر ڈھونڈ سکتے ہیں جن کے ساتھ وہ رہتے ہیں۔ بھارت کی اقلیتیں اپنی بقا اکثریت

MashalBooks.org

کے ہاتھ میں دینے پر رضامند ہیں۔ وہ لمحہ جب اکثریت اقلیت کے خلاف امتیازی سلوک کی عادت ختم کردے گی اقلیتوں کا وجود ختم ہوجائے گا۔ وہ نابود ہوجائیں گی''۔

بھارتی آئین مذہب اور زبان کی بنیاد پر استوار اقلیتوں کو ثقافتی تناظر میں تسلیم کرتا ہے اور اقلیتوں کے ثقافتی حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔ اس میں اقلیتی گروپوں کی سیاسی آواز کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ عمومی شہریت مساویانہ حقوق سے لطف اندوز ہونے کا معاملہ بالخصوص اقلیتی گروپوں کیلئے مسائل پیدا کرتا ہے جب سرکاری امور میں اکثریت کی بالادستی ہو اور یہ اکثریت ریاستی اداروں پر اپنا اثر ورسوخ مسلط کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ بھارت میں دائیں بازو کی متعصّبانہ ہندو سیاست اور سری لنکا میں سنہالی برتری پسند گروپوں میں نظر آتا ہے۔ جو تصادم اور خانہ جنگی کی صورت میں سامنے آیا۔ کثیر نسلی معاشروں میں جمہوریت کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ انتخابی نمائندگی کا میکانزم مختلف برادریوں کو گروہوں کے درمیان اختلافات پر سوچ بچار کیلئے مجبور کرتا ہے۔ سری لنکا میں سیاسی تخیل کو لسانی قطبیت کے رنگ میں رنگنے سے اقلیتوں کے قابل عمل حقوق سے بھی کافی مفر کیا گیا ہے۔ سری لنکا کے تجربے سے حکمران طبقے کی اکثریت کے مقبول ''جذبات'' کے سامنے سرنگوں ہونے اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں آئینی کمزوریوں کے اظہار کی مثال سامنے آتی ہے۔ منتخب ایوان نے اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت سے بے باک انداز میں انکار کرتے ہوئے امتیازی قوانین اور پالیسیاں منظور کیں۔ ان قوانین میں قانون برائے سرکاری زبان (1956)، شہریت ایکٹ (1948)، بالغ رائے دہی کا قانون (1949) شامل ہیں۔ اس وقت سے لسانی قطبیت نے وفاقی منصوبے کی شکست کو حقیقتاً یقینی بنادیا۔

اقلیتوں کے حقوق کی فراہمی یقینی بنانے کیلئے جاری ہونے والے ایگزیکٹو آرڈر بالخصوص انتخابی سیاست کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ حقوق کا شعبہ ختم ہوگیا اور بتدریج متعصب سیاست کے ہاتھوں یرغمال بن گیا۔ بھارت میں کانگریس حکومت کی سیکولرازم پر مبنی سوچ بھارتی جنتا پارٹی کی بنیاد پرست سیاست سے متصادم ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اقلیتوں کے حقوق سے متعلق کئے گئے ''امن معاہدوں'' کو کوئی آئینی توثیق نہیں دی گئی اور یہ صرف ایگزیکٹو ایگریمینٹ سے نافذ العمل ہیں اور ان کا وجود بالخصوص خطرے سے دوچار ہے۔ 1997 میں چٹاگانگ پہاڑوں کی ترائیوں کا معاہدہ عوامی لیگ بنگلہ دیش اور وہاں کی خودمختاری کیلئے

برسرپیکار تنظیم ''جانا سنگھٹی سمیٹی'' کے مابین ہوا لیکن اسکی کوئی آئینی حیثیت نہیں۔ یہ بنگلہ دیش کے قطبی انتخابی طرز حکمرانی کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا ہے۔ حکمران بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی نے عملاً اس کا اطلاق معطل کر دیا ہے اور یہ دعوی کیا ہے کہ اس سے بنگلہ دیش کی سالمیت متاثر ہوتی ہے۔

اقلیتی امور کا تنازع

.....شہریت کی بنیاد پر بھارتی آئین میں اقلیتی حقوق پر بحث کی تیاری: مساویانہ حقوق اور ریاست کی سیکولرازم کی حکمت عملی جو مساویانہ حقوق کے اصول کی بنیاد پر ہی قائم ہے دونوں مل کر متنازعہ صورتحال پیدا کرتے ہیں۔ ایک سطح پر سیکولرازم کے چلن نے کئی اقلیتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ خود کو سیکولر سمجھیں، مثال کے طور پر عیسائی۔ اس کے ساتھ اس نے افراد کی اپنی شناخت چھپانے کا رجحان بھی پیدا کیا ہے۔ یوں بھارت میں اکثریت پسندی میں اضافہ کیا گیا۔ دوسری سطح پر اس نے اقلیت پسندی کے خلاف لہر بھی پیدا کی۔

جمہوری ڈھانچوں کی طرف سے مساوات کی فراہمی میں ناکامی، الٹا امتیازی سلوک، دبانے یا بیدخل کرنے کی حوصلہ افزائی کرنے سے ریاست کی طرف سے کچھ محروم طبقوں کی مدد کرنے کی سمت میں اپنی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت پر زور پڑتا ہے۔ اس سے گروپوں کی تقسیم پر نہ ختم ہونے والے مطالبات نے بھی جنم لیا کہ کن بنیادوں پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ کیا اس میں مساویانہ حقوق مضبوط کرنے کی صلاحیت تھی؟ سیاسی امور کے ماہر گرپریت مہاجن (1998:1) کہتے ہیں کہ ''..... جب اقلیتی حقوق کو مساوات کی بجائے ثقافتی تنوع کی حفاظت اور بچاؤ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تو ایسے حقوق کا نتیجہ اکثر موجودہ گروہوں میں تقسیم کی صورت میں نکلتا ہے''۔ زیادہ سے زیادہ اقلیتیں خصوصی حیثیت یا خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں اور شہریت کے عمومی فوائد نہیں چاہتیں۔ مہاجن نے مزید لکھا ہے کہ ''اقلیت پسندی (Minoritization) تقسیم نو کے دعوؤں کے تناظر میں روایت بن جاتی ہے اور اس کا تعلق پہچان اور بقا کے علاوہ مسابقانہ شناخت اور تقسیم کی شناخت سے بھی ہے۔ (مہاجن 1998-121-11)

اس کے نتیجے میں آئین پسندی..... بنیادی آزادیوں، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق پبلک پالیسی اور قانون.....عدم مساوات، خودمختاری کے مطالبات اور نقل مکانی پر منتج ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

جنوبی ایشیا اور نوآبادیاتی حکمت عملی

جنوبی ایشیا کا نسلی جغرافیہ گروہوں کی تحریکوں سے تشکیل پایا جس سے سیال اور کثیر تہہ کی حامل شناختیں وجود میں آئیں۔ نوآبادیاتی حکمت عملی کا مقصد ان سیال شناختوں کو راسخ کرنا اور ادارہ جاتی شکل دینا تھا۔ برطانوی سامراج نے نوآبادیوں کو مخصوص طرز حکمرانی سے کنٹرول کیلئے گروہی شناختوں کو بنیاد بنایا۔ یہ گویا ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کا معاملہ تھا۔ سامراجی طاقت کی انتظامی عادات حکمرانی میں علاقہ جاتی کنٹرول کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ انفرادی حیثیت کی حامل انتظامی سرحدیں کھینچنے سے لسانی، مذہبی اور نسلی بنیادوں والے گروہ وجود میں آئے اور وہ لوگ جن کے پاس تاریخ، شناخت اور خطے کا اجتماعی احساس تھا وہ اقلیتوں میں بٹ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام کی پیدا کردہ معیشتوں نے تحریری معاہدے کے ساتھ پوری سلطنت میں سفر کرنے والے مزدوروں کے نئے گروہوں کو جنم دیا۔

سامراجی حکومت کی طرف سے مذہب کو انتظامی معاملات اور انتخابی تقسیم میں بنیادی عنصر کے طور پر متعارف کرانے سے مخصوص سیاسی معانی وجود میں آئے جیسا کہ ''ہندو'' اور ''مسلمان''۔ دیگر پہلوؤں کی قیمت پر شناخت کے مذہبی پہلو کو ترجیح دی گئی۔ گروہ بندی اور تعمیر نوآبادیاتی علم کے منصوبے کے ثمرات تھے جنہیں کسی نوآبادی پر حکومت کیلئے فروغ دیا گیا۔ اس عمل میں شناختوں کو ضروری قرار دیا گیا اور دیگریت کے باہمی ناقابل مصالحت تعلقات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سیاسی نمائندگی کے معاملے میں جداگانہ طرز انتخاب نے ان اختلافات کو سیاسی میدان میں ادارہ جاتی شکل دی۔ آزادی کے بعد بننے والی حکومتوں نے اس عمل کا تسلسل جاری رکھا اور صرف انہی مذہبی اقلیتوں کو تسلیم کیا گیا جن کا انگریز دور میں وجود تھا اور جنہیں سیاسی حقوق حاصل تھے۔ بھارتی سپریم کورٹ نے کئی اقلیتوں مثلاً دلتوں، آریا سماجیوں اور جینوں کے خلاف فیصلے دیے جو اکثریتی نسل ہندوؤں کے درمیان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ (بال پٹیل بنام یونین آف انڈیا 2005)۔

سری لنکا میں نوآبادیاتی ریاست نے سمجھا کہ سیاسی گروہوں کو نسلی بنیادوں پر عوامی گروپوں .....سنہالی، تامل اور برگھر..... کے طور پر شناخت اختیار کرنی چاہیئے۔ گویا یہ شناخت ''نسلی'' تھی۔ سامراجی حکومت نے اکثریتی سنہالی آبادی کو محروم رکھا جبکہ اقلیتی تاملوں کو نوازا گیا۔ تامل اقلیت کو

آئینی اصلاحات کے عمل میں بتدریج شامل کیا گیا۔ نتیجتاً نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد سری لنکا میں حکمران طبقے کے اندر تقسیم بالکل واضح نظر آتی ہے۔

نوآبادیاتی انتظامیہ نے مزید یہ کیا کہ قانونی جامعیت کو حکومتی ڈھانچے کے طور پر متعارف کراتے ہوئے گروہی وجود کو نمایاں کیا۔ سرکاری شعبے میں یکساں نوآبادیاتی قوانین جبکہ انفرادی میدان میں مذہبی بنیاد پر استوار روایتی قوانین متعارف کرائے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسا نظام روایتی قانونی معاہدوں میں نمایاں احترام کا متحمل ہوا جس میں زمین کے مشترکہ حقوق کو تسلیم کرنے کے ساتھ ''خون آشام'' اغیار سے تحفظ فراہم کیا گیا۔ بالخصوص اصل باشندوں کو۔ تاہم تب اور اب جہاں ان دونوں قسم کے قوانین خودمختاری کے متحمل ہوئے وہاں اپنوں نے نہ صرف ''اغیار'' بلکہ ''اپنوں'' کے خلاف امتیازی سیاست کا اطلاق کیا۔ ان محروم اور متاثرہ طبقوں میں بالخصوص خواتین اور پسی ہوئی ذاتیں شامل تھیں۔

نوآبادیاتی دور کی خصوصی خودمختاریاں

برطانوی سامراج کے دوران ہندوستان کے انتظامی ڈھانچے میں کئی اقسام کی خصوصی خود مختاریاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر شمال مشرقی، وسطی ہندوستان اور پہاڑی علاقوں کی قبائلی پٹی میں قائم شاہی ریاستیں اور شمال مغرب میں مقیم قبائلی آبادی۔ قبل ازیں قبائلی علاقوں کو انتظامی ڈھانچے کے ماتحت لانے کی کوششوں کا نتیجہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بغاوتوں کی شکل میں نکل چکا تھا۔ سامراجی حکومتوں نے ان کی زمینوں کو شیڈولڈ علاقے قرار دیا تاکہ انہیں بیرونی اور اجنبی عوامل سے محفوظ بنایا جاسکے۔ ہندوستان کے شمال مشرقی پہاڑی علاقے ...جو برطانوی انتظامیہ کے قوانین والے علاقوں اور ضمنی یا کلی طور پر خودمختار قبائل کے درمیان لکیر تھے، کی وجہ سے میدانی اور قبائلی علاقوں کے درمیان رابطہ محدود ہوگیا۔ آزادی کے بعد ان پہاڑی علاقوں کی خصوصی حیثیت میں توڑ پھوڑ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر چٹاگانگ کے پہاڑی اضلاع میں ریگولیشن 1900 کا خاتمہ اور اس علاقے کی ''قطعاً مختلف'' شناخت کی تحلیل۔ اس کے نتیجے میں بیرونی عناصر کی طرف سے ان علاقوں کا رخ ہوا اور حکومتی سرپرستی میں بنگالیوں کی آبادکاری ہوئی جس سے تصادم نے جنم لیا۔

MashalBooks.org

شمال مشرقی سرحدی صوبہ جو افغانستان سے جڑا ہوا ہے اور جہاں کی آبادی عسکریت پسند اور آزادی پسند پشتون قبائل پر مشتمل ہے وہاں برطانوی انتظامیہ نے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا) قائم کئے۔ جس کا مقصد برطانوی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان بفرزون قائم کرنا تھا۔ ان علاقوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی گئی اور جہاں قبائلی سردار اسامہ بن لادن کی آمد اور پاکستانی فوج کے ناخوشگوار آپریشن سے پہلے تک اپنے معاملات خود چلاتے رہے ہیں۔ 2004 میں پہلی بار پاکستانی فوج فاٹا کے علاقوں میں داخل ہوئی اور فوجی دستے وہاں تعینات کر دیے گئے۔ فاٹا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں روایتی قواعد خواتین کے حقوق سے انکار کرتے ہیں۔

تقسیم ہند کا سایہ

عدم مصالحت پر مبنی شناختوں کا حامل سیاسی عمل جسے تاریخ کے متنازع حوالوں کا جواز حاصل تھا 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کا باعث بن گیا۔ دوقومی نظریے کی حمایت میں زیادہ تر اشرافیہ کی زیر قیادت حلقوں کے اجتماع کے نتیجے میں ہندوستان پر تشدد طریقے سے 2 ملکوں اور پھر 3 ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس تناظر میں علاقائی تقسیم کے لئے نسلی سیاست اور تعصب کے حوالے سے تناؤ دیکھنے میں آیا۔ اس سے اکثریتی منطق کی حامل جمہوریت کی تعریف وجود میں آئی جس کا بنیادی حصہ غالب اشرافیہ کی ''مقامی وفاداری'' پر مشتمل عدم مساوات کی سوچ پر مبنی تھا۔ وہ گروہ جو مختلف شناختوں کے دعویدار تھے قومی شناخت پر سمجھوتہ کرتے اور اس سے متحارب ہوتے نظر آتے۔

بھارت میں تقسیم کا سایہ آئین ساز اسمبلی کی بحثوں پر پڑا، جس سے اس کے لبرل ایجنڈے، مشترکہ حکومت اور خودحکمرانی کے پہلوؤں پر زد پڑی۔ مابعد تقسیم وفاقیت کو نفاق کے بیج کا حامل سمجھا گیا۔ اقلیتوں کے سیاسی حقوق تسلیم کرنے کے اقدام کے سامنے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ ''ہم ایک قوم کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور وہ لوگ جو تقسیم اور انتشار کے بیج بونا چاہتے ہیں ان کیلئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی''۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقلیتوں کے حقوق کا معاملہ سرد مہری کے ساتھ صرف ان کے تحفظ کے طور پر لیا گیا اور اسے جمہوری قومیت کے ناگزیر جزو کے طور پر نہ تسلیم کیا گیا۔ اس امر سے بھارتی حکمران

MashalBooks.org

وفاقیت کے ڈھانچے سے احتراز کرنے لگے اور اسے ''یونین آف انڈیا'' اور ''مرکز ریاست تعلقات'' کا نیا نام دیا گیا اور نسلی علاقائیت پر مبنی خودمختاری کے مطالبے کی مزاحمت کی گئی۔ آغاز میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کو تسلیم کرنے کی مخالفت کی گئی۔

پاکستان میں تقسیم کے بعد نئے حکمرانوں نے فیصلہ کیا کہ کسی ''قومی'' اقلیت ..... بنگالی، بلوچی، سندھی، پشتون.....کو تسلیم نہیں کیا جائیگا کیونکہ اس سے ایک مسلمان قوم ہونے کے ریاستی نظریے میں پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔ نتیجتاً پاکستان کے حکمران طبقے کے مشرقی پاکستان کے ساتھ اندرونی کالونی جسے امتیازی سلوک اور غیر جمہوری سیاست کی وجہ سے اردو بولنے والوں اور پنجابیوں کی برتری قائم ہوئی اور بنگالی ثقافتی شناخت تسلیم کرنے سے احتراز کیا گیا۔ جس کے باعث علاقائی۔ ثقافتی قوم پرستی کی شناخت تسلیم کرانے کی جدوجہد میں تیزی آئی۔ پھر ایک پُرتشدد تقسیم کے ساتھ بنگلہ دیش وجود میں آ گیا اور پنجابی مقتدر طبقے کے تعصب میں اضافہ ہوا اور کہا گیا کہ خودمختاری کے نعرے کا مطلب وفاق توڑنے کے مترادف ہے۔ تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو کوئی قوم ایسے افراد کے اتحاد کا نام ہے جو مشترکہ تاریخ، علاقے، نسل، زبان اور مذہب کے بندھن میں بندھے ہوئے ہوں۔ یہی وہ عمومیت ہے (جو بعض لحاظ سے بنائی یا ''تصور'' کی جاتی ہے) جو تنوع اور کثیریت پر سبقت لے جاتی ہے۔ جیسا کہ مختلف دساتیر کے ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بننے والے ریاست سازی کے عمل میں مذہبی، لسانی اور نسلی حوالے سے اکثریت کو فائدہ پہنچایا گیا جبکہ اقلیتوں کی محرومی اور مرکزی دھارے سے بیدخلی کو یقینی بنایا گیا۔

اقلیتوں کو خصوصی حقوق کی ضرورت کیوں ہے

ایک ہی قسم کے قانونی حقوق کے تحت رہنے والی اقلیت اور اکثریت کے افراد کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے کے لئے مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رہنما اصول کہ تمام انسان برابر، غیر منقسم اور لاینفک ہیں یا پھر برابری اور غیر امتیازی سلوک سے متعلق ان اصول ہائے کے آئینی ڈھانچے اور ادارہ جاتی معاملات پر اطلاق اقلیتوں کے لئے یکساں طور پر حقوق پر لطف انداز ہونے کو یقینی نہیں بناتا۔ حتٰی کہ اقلیت یا اکثریت سے تعلق رکھنے والے افراد کی برتری یا

محرومی، مساویانہ حقوق اور بنیادی آزادیوں کا معاملہ بھی مخصوص پالیسیوں کے بغیر ممکن نہیں بنایا جاسکتا: مثال کے طور پر اکثریت کی زبان کو عموماً قومی زبان سمجھا جاتا ہے اور نتیجتاً قدرتی طور پر اس زبان کے فروغ کے اقدامات کئے جاتے ہیں لیکن ایسا اقلیت کی زبان کے معاملے میں نہیں ہوتا جسے خصوصی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ خالصتاً رسمی مساویانہ سلوک..... جمہوریت کی فعالیت اور صرف انسانی حقوق تنہا طور پر امتیاز کی الجھن دور نہیں کر سکتے۔

بھارتی آئین ترجیحی پالیسیاں فراہم کرتا ہے جو مساوی حقوق کے اصول کے منافی ہے۔ اس نے پسماندہ گروہوں کے حق میں دوٹوک اقدامات کو یقینی بنایا ہے اور تسلیم کی گئی اقلیتوں کیلئے الگ اصول وضع کیا ہے۔ ایک پرائیویٹ شعبہ جو کسی اقلیتی گروپ کی شناخت برقرار رکھنے کیلئے مخصوص ہے۔ یہ دراصل ''مشترکہ شعبے'' کے برعکس ہے یا پھر سرکاری شعبے میں مشترکہ ریگولیٹری اتھارٹی کے منافی ہے چنانچہ ''منفی ضمانتوں'' کی یہ ملی جلی حکمت عملی اور مثبت امتیازی سلوک تحفظ کی فراہمی اور مساویانہ حقوق اور جمہوری شرکت دونوں کے فروغ کیلئے ایک کمزور ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ اس نے اقلیت پسندی، نئی اقلیتوں یا پسماندہ ذاتوں کی طرف سے شناخت کی چیخ وپکار کو جنم دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اکثریت کے مذہبی اقلیتوں کیلئے ''تشفی'' کے خلاف غصے اور ناراضگی کا بھی شاخسانہ ہے یا اونچی ذاتوں کی طرف سے نابود ہونے کے الزامات کا باعث ہے۔ روزمرہ کا امتیازی سلوک، محرومی یا تشدد جس کا اقلیتوں یا اصل باشندوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے سے اقلیتی حقوق کے تحفظ میں امن پسندی کی حدود کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جب اقلیتوں کے مخصوص حقوق معاشرے کے انصاف اور رواداری کی اقدار میں گہری جڑیں نہیں رکھتے۔

محروم طبقے کی اجتماعی شناخت

قانون کے تحت دی گئی مساوات کی ضمانتوں کا اطلاق افراد پر نہیں ہوتا۔ تاہم تجربہ یہ بتاتا ہے کہ امتیازی سلوک کی ہر شکایت اور مساویانہ سلوک کے حق کا ہر دعویٰ تقریباً انہی گروہوں اور طبقوں کے افراد کی طرف سے سامنے آیا جو منظّم، برتر اور سیاسی طور پر طاقتور گروہوں کی ناانصافی کا شکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ عدالتی شکایات اور امتیازی سلوک کے دعوؤں کا عمل اور اس کے ساتھ ساتھ مساویانہ سلوک کی فرضی ضمانت پر مشتمل فریم ورک کے تحت ''دوٹوک اقدام'' بظاہر محروم

طبقے کی اجتماعی شناخت کا نفاذ کرتا نظر آیا ہے؟ اکثر و بیشتر یہ عمل محرومی کی حقیقتوں سے منسلک رسوائی کو دائمی رنگ دیتا نظر آتا ہے۔ یہ کھیل سرکاری ملازمتوں اور تعلیم کے شعبے میں غیر منصفانہ حکمت عملی اور سرکاری یا قانونی محاذ پر ڈارمائی انداز میں کھیلا گیا۔

کثیر ثقافتیت اور ثقافتی تنوع: ثقافتی حقوق کا تیر بہدف نسخہ

اختلاف قبول کرنے کے سیاسی چیلنج نے کئی حکمت عملیوں کو جنم دیا ہے۔ جذب کرنے اور انضمام وسائل کی سیاست سے کثیر القومیت اور خودمختاریوں تک۔ کثیر ثقافتیت (Multiculturalism) اور خودمختاری دونوں مابعد نوآبادیاتی کثیر نسلی، کثیر مذہبی اور تارکین وطن کی اکثریت والے معاشروں میں گہرے اور مزاحم تنوع کے چیلنج سے نمٹنے کی فلسفیانہ اور مستقل سوچ کے طور پر ابھرے ہیں۔ کثیر ثقافتیت کی عملی منطق کو خونریز تصادم کی روک تھام پر کارنیگی کمیشن (1997) نے مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''کسی کو (نسلی، ثقافتی اور مذہبی اختلافات پر) دبانے کا نتیجہ اکثر خونریزی کی شکل میں نکلتا ہے اور ایک کے بعد دوسرے کیس میں کسی مناسب آئینی ڈھانچے کے اندر تنوع کو اکاموڈیٹ کرنے سے مزید تنوع میں سامنے آتا ہے''۔

جہاں کثیر ثقافت کی اصطلاح ایک یا دو ثقافتوں سے زائد ثقافتوں کی موجودگی ظاہر کرتی ہے وہاں کثیر ثقافتیت سے مراد کسی قوم۔ ریاست کی شناخت کو سمجھنے میں مرکزی حیثیت کی حامل مختلف کمیونیٹیز کی شناختوں کی تشکیل کے حوالے سے ثقافتی تنوع کی مستقل پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ ملٹی کلچرسٹ کی بحث کا جزو لاینفک یہ سمجھنا ہے کہ نسلی اقلیتیں صرف افراد پر نہیں بلکہ ایسے منظم گروہوں پر بھی مشتمل ہوتی ہیں جو اپنے مطالبات اجتماعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

کثیر ثقافتیت کی بین الاقوامی سطح پر ہونے والی بحث میں کثیر ثقافتیت کو اقلیتوں سے نتھی کرنے کا رجحان نظر آتا ہے پھر اس کے بعد اسے نسلی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مصنف بھیکو پاریکھ نے اپنی کتاب ''ری تھنکنگ ملٹی کلچرازم'' میں واضح کیا ہے کہ ملٹی کلچرسٹ کی حاوی بحث میں اکثریتی ثقافت کو بلاتنقید تسلیم کیا اور اقلیتوں کے حقوق اور دعووں کا جائزہ لینے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''کثیر ثقافتیت دراصل دو یا زائد گروہوں کے درمیان تعلقات کی مناسب اصطلاح سے متعلق ہے۔ ایسے مطالبات کو کنٹرول کرنے والی اقدار بشمول انصاف کے اصولوں کا

MashalBooks.org

ماخذ صرف ایک کلچر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے دونوں پر کھلا مکالمہ ہونا ضروری ہے''۔

ایسا مکالمہ اگر ناممکن نہیں تو ایسی صورت میں پریشان کن ضرور بن جاتا ہے جب بین الاقوامی مباحثے میں کسی ایک کلچر مثلاً اسلام، کو مطعون کیا جاتا ہے یا پھر مخصوص نظریات جیسا کہ ''تہذیبوں کا تصادم''۔ کثیر ثقافتیت اور اس کے متضاد امور ثقافتی تنوع اور بقائے باہمی کے ناقدین کو اقلیتی حقوق کے تحفظ کی سٹرٹیجی پر پریشان کن لگی ہے کیونکہ اس کی بنیاد بدستور اکثریت پر ہے اور ریاستی ڈھانچے اور اختیارات کی تقسیم کی بنیادی اساسوں کی جانچ پڑتال نہیں کرتی۔ امتیازی سلوک کے خاتمے کا ہدف حاصل کرنے کیلئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کسی معاشرے میں طاقت کا اطلاق کیسے ہوتا ہے اور یہ کہ کیا اختیارات کا ڈھانچہ بعض اقدامات جیسا کہ سری لنکا میں 2 زبانوں کی پالیسی ہے سے کیسے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جمہوریت میں اقلیتی حقوق کا تعین کرنے کے بجائے ثقافتی شناخت پر سیاست کے حوالے سے اقلیتوں کا سوال کافی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیشتر اوقات ثقافتی شناخت کی سیاست سے عدم رواداری اور نفرت انگیزی نے جنم لیا اور ان کا تعلق قوم پرست، نسل پرست اور برادری کی بنیاد پر قائم تنظیموں سے استوار ہوجاتا ہے۔

اقلیتی حقوق کا جواز 2 بنیادوں پر ملتا ہے۔ اول۔ امتیازی سلوک کے منظم طریقہ ہائے کار پر قابو پاتے ہوئے مساویانہ سلوک یقینی بنانا۔ دوم۔ ثقافتی خودمختاری کا تحفظ اور ثقافتی تنوع کا فروغ۔ جہاں کثیر ثقافتیت مؤخر الذکر کا احاطہ کرتی ہے — یعنی ثقافتی شناخت کا تحفظ۔ وہاں یہ مساوات غیر امتیازی سلوک اور مؤثر انصاف کے فروغ میں ناکام رہی ہے۔ بھارتی آئین اقلیتی حقوق کا فریم ورک ثقافتی کیٹیگری کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ گرپریت مہاجن (1998:11-12) کے نزدیک یہ نکلا کہ جہاں اقلیتی حقوق کا تصور ثقافتی خودمختاری اور تنوع کا ایک آلہ بن چکا ہے وہاں اس نے مساوات اور انصاف کی فراہمی یقینی نہیں بنائی۔ جنوبی ایشیا میں تنوع کے فلسفے اور اقلیتی برادریوں کو مراعات دینے کی حوصلہ افزائی کے پالیسی رسپانس کے طور پر کثیر ثقافتیت جبر، انکار، گروہوں کی تحلیل اور مرکزی دھارے سے اخراج کی سیاست پر عملدرآمد کے ریاستی عزم کو قومیانے کا کمزور جواب ہے۔ اقلیتی حقوق کا سوال کے قلب میں جمہوری خسارہ واقع ہے۔ جمہوریت کے نظام کو پارلیمانی انتخابی رائے دہی، انتخابات، آزاد پریس اور عدلیہ کے حوالے سے محض مقدس بیان بازی سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیئے۔ اسے شراکتی مکالمے جس میں

انصاف، برابری، کثیریت اور اجتماعی حقوق کے تصور شامل ہوں کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہے۔

خودمختاریاں: جمہوریت کی ابھرتی ہوئی کہانی

اقلیتی گروپوں کی جمہوری عمل میں متحرک شرکت ان کی شناخت کے تحفظ اور مساوات کے مواقع کے فروغ میں اختیارات کا ارتکاز، تقسیم اور از سرنو فراہمی ناگزیر ہے۔ خصوصاً جمہوری نظام ہائے میں اکثریت کی طرف نظر انداز کرنے کیلئے اقلیتی گروپوں کی روزمرہ کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ شرکت پر زور بڑھتا جارہا ہے۔ سب سے زیادہ جس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے یا جس کی سب سے زیادہ مزاحمت کی جاتی ہے اور جو لوگوں کی ''اپنی حکومت'' پر مبنی خواہشات کی عکاس ہے وہ خودمختاری (Autonomy) ہے۔ خودمختاری ایک طریقہ کار ہے۔ جس سے اقلیتی گروپوں کو اپنی دلچسپی کے حامل معاملات پر براہ راست کنٹرول حاصل ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ بڑے گروہ کو وہ اختیارات استعمال کرنے کی اجازت مل جاتی ہے جو مشترکہ مفادات پر حکومت کرتا ہے۔ خودمختاری کی کوئی منطقی تعریف موجود نہیں: یہ آئینی، قانونی اور انتظامی صورتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں ثقافتی خودمختاری، مذہبی خودمختاری، نیم علاقائی خودمختاری اور علاقائی خودمختاری جیسے معاملات بھی شامل ہوتے ہیں۔

عمومی معنوں میں خودمختاری وفاقیت کا حاطہ کرتی ہے۔ جہاں عام طور پر تمام علاقے ایک جیسے اختیارات کے حامل ہوتے ہیں تاہم غیر متشکل وفاقی انتظامات خصوصی خودمختاریوں کو بھی موقع فراہم کرتے ہیں۔ کثیر نسلی ریاست کیلئے وفاقی انتظامات بالخصوص موزوں ہوتے ہیں چونکہ ان کے تحت نسلی گروہوں کو خودمختاری ایک اہم شکل میں استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے انتظامات متنوع ثقافتی اور لسانی روایات کو اکاموڈیٹ کرسکتے ہیں۔ جو نسلی گروہوں کے مابین برابری یقینی بناتی ہیں اور ان کے مرکز کے ساتھ تعلقات کی جامع بنیاد مہیا کرتی ہیں۔ وفاقی انتظامات شناخت کی سیاست کی شوریدہ اہمیت میں کمی کا موجب بنے ہیں۔ موجود دور کی بحثوں میں شناخت کی سیاست اور نسل پرستی کو اہم مقام حاصل ہے۔ (وسائل پر تصادم اور کلاس کی فالٹ لائن سے صرف نظر کرتے ہوئے)۔ اس سے ریاست۔ قوم کی تقسیم سامنے آئی ہے۔ اکاموڈیٹ کرنے کے حوالے سے ثقافتی تنوع سے کہیں زیادہ خودمختاری کو تیر بہدف نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ خودمختاری کو

MashalBooks.org

انصاف اور وقار کیلئے جدوجہد کرتے افراد کے تنازعات حل کرنے کا آلہ سمجھا جاتا ہے۔جس سے یہ افراد اختیاراتی تعلقات کی تشکیل نو اور وسائل پر کثیر الجہتی کنٹرول کے قابل ہوجاتے ہیں۔ خودمختاری کو اندرونی خودحکمرانی کا راستہ سمجھا جاتا ہے جہاں ریاست کی علاقائی سالمیت میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی اور وہ اقلیتوں کے سماجی ثقافتی اور سیاسی حقوق کا تحفظ بھی کرتی ہے۔

ماہر امور سیاست لیش گھئی کہتے ہیں کہ انسانی حقوق کی تحریک میں تیزی کی وجہ سے افراد نے بین الاقوامی قانون کے تحت اپنا وہ مقام حاصل کرلیا ہے جس سے اب تک وہ محروم تھے۔خود مختاری کی تحریک کے تحت گروہوں (گروہ کے حقوق) نے شناخت حاصل کی ہے۔جس سے خود ارادیت کے اصولوں کو مہمیز ملی ہے۔(گھئی2000)۔بلاشبہ اختیارات سے متعلق ان دونوں بحثوں یعنی انسانی حقوق اور خودمختاری سے مخصوص سوالات جنم لیتے ہیں۔کیا حق خود ارادیت اقلیتی گروہوں کی خودمختاری کی بنیاد فراہم کرتا ہے؟ کیا خودمختاری ایک حق ہوتی ہے یا ریاست کا عطیہ ہوتی ہے؟ مختلف یا مشترکہ مفادات یا شعبوں میں منصفانہ توازن بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔خودمختاریوں کی فعالیت سے یہ سوالات سامنے آتے ہیں۔ یہ ممکن کیسے ہوسکتا ہے کہ علاقائی شناخت بمعہ خودمختاری کی وفاق نواز مصالحت کا عمل اقلیت پسندی یا تفریق کی بجائے جمہوریت کو مضبوط کرتا ہے؟ کیا مرکزی ذریعہ قانون کے طور پر قانونی نظریہ خودمختاری کے معاملات کیلئے موزوں ہوسکتا ہے؟۔کیا مختلف گروہوں کے درمیان عدم مساوات کی طویل المدت نمو کا آلہ بننے کے باوجود قانونی کثیریت کا دفاع کرنا چاہیئے؟۔

یورپی اور امریکی انسانی حقوق اور اقلیتی حقوق کے فریم ورک اندرونی خودارادیت کی بحث میں خودمختاری کی متحرک ذریعے کے طور پر ستائش کرتے رہے ہیں۔البتہ ریاست کا خودمختاری فراہم کرنے اور اسے چلانے پر متفق ہونا حالات سے مشروط ہوتا ہے۔بشمول اقلیتی گروپ کا علاقائی ارتکاز، سیاسی امور کے ماہر کے طور پر رجنی کوٹھاری(1989) ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ''وفاقیت کیلئے جدوجہد دراصل بنیادی طور پر عظیم تر جمہوریت کی لڑائی ہے جس میں لوگ اپنی سماجی شناختوں اور تنظیمی شکلوں کے ذریعے متحرک ہوتے ہیں۔جن کے ذریعے وہ راحت محسوس کرتے ہیں اور جن کے ذریعے وہ اپنی طاقت حاصل کرتے ہیں اور انہیں عزت نفس میسر آتی ہے''۔

جنوبی ایشیا میں ریاستیں اکثر اختیارات کی تقسیم میں اگر جارحانہ نہ بھی ہوں تو گریزاں ضرور

ہوتی ہیں۔ بیشتر نے متحدہ ریاستوں کی صورت میں تشکیل پائی ہے۔خصوصاً انتظامی طور پر مرکز گریزی نظر آتی ہے۔حتٰی کہ بھارت جو وفاق گریزی کے تجربات میں کافی بے باک ہے نے بھی مرکزیت اور مطلق العنانیت پر مبنی ایسا آئینی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے کہ اس کا نتیجہ شمال مشرقی سرحدی ریاستوں پنجاب اور جمہوں وکشمیر میں پرتشدد تصادم کی صورت میں سامنے آیا ہے۔اس منظرنامے کے دوسری طرف سری لنکا ہے جہاں سیاسی تصور کی انتہائی لسانی قطبیت نے ''خودمختاری'' جیسے عوامل پیدا کئے ہیں جن سے اندرونی خودارادیت کو سیاسی اعتبار سے نا قابل قبول بنادیا گیا ہے۔

قانونی کثرت پسندی: متعدد قانونی معاہدوں کی بقائے باہمی

قانونی کثرت پسند کی تعریف کسی خودمختار ریاست کے اندر 2 یا اس سے زائد قانونی نظام ہائے کی بقائے باہمی اور نفاذ کے طور پر کی جاسکتی ہے۔اکثر اسے خودمختاری کی اہم شرط کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ قانونی کثرت پسندی مخصوص قانونی روایات کی خودمختاری کا بھی اشارہ کرتی ہے۔مثال کے طور پر علاقے کے اصل باشندوں سے تعلق رکھنے والی روایات۔اس کا مطلب مختلف قانونی ناگریز معاملات، حالات، ثقافتوں، روایات اور طریقہ ہائے کار پر مکالمہ آنا بھی ہے۔مثال کے طور پر ان فطری اور مشترکہ پراپرٹی وسائل کی مینجمنٹ جو اصل باشندوں کی معیشت کو ظاہر کرتے ہیں۔ہمارا مشورہ یہ ہے کہ روایات کو قانونی مقام دیا جائے تاہم ان دنوں ریاست کا کردار ایک غیر جانبدار امپائر جیسا ہے جو مختلف گروپوں کے درمیان توازن قائم رکھتی ہے: یہ ریاست نسلی مسابقت اور جدوجہد میں متحرک کردار ادا کرتی ہے۔مثال کے طور پر جنوبی ایشیائی ریاستوں کے مذہبی تعصب نے خواتین کے جائیداد پر روایتی حقوق کا استحصال کیا ہے۔اس کے علاوہ خواتین کے زندگی کے حقوق اور آزادی کو جرگوں اور کھپ پنچایتوں کے متوازی قانونی ڈھانچوں سے نقصان پہنچایا گیا ہے۔

ایشیا کے کئی خطوں میں زمینی کی روایتی ملکیت میں مردوں کی طرح خواتین کو بھی حصہ دار سمجھا جاتا ہے۔کئی علاقوں میں ازدواجی وراثت عام ہے۔البتہ کئی اصل باشندوں کی زندگیوں میں مداخلت کے باعث مردوں اور خواتین کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک بھی دیکھنے میں آیا ہے۔مقامی

MashalBooks.org

ریاستوں میں انفرادی حقوق ملکیت، جبری آبادکاری، ازالے، ٹیکسوں یا فوائد کی شراکت کے مقاصد میں گھریلو سربراہ کی رجسٹریشن اور روغن (جوس وغیرہ) نکالنے کی صنعتوں ان تمام شعبوں میں مردوں کو خواتین پر ترجیح دی جاتی ہے۔اس کا نتیجہ اصل مقامی خواتین کے حقوق کے استحصال اور غربت یا معیار زندگی میں کمی کی صورت میں نکلا ہے۔

کئی ادارہ جاتی میکانزم کثیری قانونی نظام ہائے کی موجودگی کے باضابطہ اظہار کا باعث بن سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک وفاقی نظام آئینی طور پر حکومت کی 2 سطح پر قانون سازی کا اختیار تفویض کرتا ہے۔ یہ دونوں اپنی قانونی اتھارٹی کے دائرہ کار کے اندر نسبتاً خودمختار ہوتی ہیں۔ایک ریاست عوام کی بہتری کیلئے علاقائی یا مقامی سطح پر حکومتی اختیارات کی تقسیم کرسکتی ہے۔

اجتماعی اقلیتی قانونی کثرت پسندی کے فروغ کی صلاحیت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے کہ ان کے ذریعے ایک ایسی اقلیتی برادری تشکیل پاتی ہے جو وسیع تر معاشرے کے اندر قانون سازی کے اختیار کے ساتھ نسبتاً تحفظ کا ماحول پاتی ہے۔جنوبی ایشیا میں گورننس فریم ورک کا نوآبادیاتی ورثہ موجود ہے۔ جو عائلی قوانین اور وراثتی قوانین کے ضمن میں سرکاری شعبے (عمومی قانون) اور نجی شعبے (مخصوص کمیونٹی کے حوالے سے قانونی دستاویزات) میں تقسیم ہے۔ یہ خالصتاً سرکاری شعبے کے مردوں ایسے نجی شعبے جو خواتین کی زندگی سے متعلق امور سرانجام دیتے ہیں کے درمیان منفی تقسیم ہے۔آزادی کے بعد ریاست کی مذہبی نوعیت کے باعث خواتین کے اجتماعی امور اور ریاست کے درمیان تعلقات کار کی تعمیر میں کردار کو اہمیت دینا ناگزیر ہوگیا۔اس بنا پر ڈرامائی انداز میں شاہ بانو کیس کے فیصلے پر بحث چھڑ گئی جو بھارتی ریاست ہندو اکثریت، مسلمان اقلیت اور خواتین کا احاطہ کرتا ہے۔ درحقیقت اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کو اکثر و بیشتر اپنے معاشرے کے اندر اکثریتی کمیونٹی کی نسل پرستی اور مذہبی پہلو سے نمٹنے کے لئے ملائیت سے لڑنا پڑتا ہے۔یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر پاکستان کی حقوق نسواں کی علمبردار روبینہ سہگل کو یہ کہنا پڑا کہ خواتین بیک وقت دو ریاستوں کے زیرسایہ زندگی بسر کرتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پورے جنوبی ایشیا میں ایسے سماجی، مذہبی اور قانونی متعصّبانہ ڈھانچے ہیں جو ''غیرت'' کے نام پر خواتین کا استحصال کرتے ہیں اور انہیں جان سے مار بھی ڈالتے ہیں۔حقوق نسواں کی علمبردار طاہرہ ایس خان نے اپنی کتاب ''Beyond Honour'' (2006:227-28) جو

غیرت کے نام پر قتل'' سے متعلق جامع بین الاقوامی سروے ہے میں اس شرمناک فعل کی سب سے بڑی وجہ ماورائے عدالت قانونی نظام ہائے کو ٹھہرایا ہے۔ یعنی جرگہ، پنچایت وغیرہ۔ یہ جرگے روایتی قبائلی یا جاگیردارانہ انصاف کے اصولوں سے اپنا قانونی جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ ''جرگہ او ربرادری کی پنچایت کی طاقت نو آبادیاتی حکومتی روایات کا شاخسانہ ہے جو جاگیرداروں کو مقامی لوگوں کے خلاف بلا روک ٹوک اختیارات فراہم کرتی ہیں۔ یہی روایات آزادی کے بعد مذہبی نوعیت کی ریاستوں کو آگے منتقل ہوگئیں''۔ ''غیرت'' (خواتین کے جنسی افعال پر مردوں کے کنٹرول کے حوالے سے خواتین رشتہ داروں سے عزت/شرم کی بنیاد پر زیادتی) ونی (بیٹی کو قصاص کے طور پر مخالف پارٹی کو دے دینا) کا نظریہ دشمن کی عورت کے ساتھ اجتماعی زیادتی، تیزاب سے حملے، خودکشیوں، جبری شادیوں، لڑکیوں کے قتل یا خاندانوں کے ہاتھوں فروخت جیسے تضاد کے افعال کے گرد گھومتا ہے۔ ''غیرت'' کے نام پر ان جرائم کی مقامی جرگے اجازت دیتے ہیں، ان جرائم کو سزا سے استثنیٰ کے کلچر کے اندر سماجی چھوٹ کے حامل ہوتے ہیں بلکہ ریاستی ادارے بھی ان کی حمایت کرتے ہیں۔

ان پر تشدد جرائم کی جڑیں قبائلی اور جاگیردارانہ نظام انصاف میں ہوتی ہیں او رخاندانی روایت اسے قانونی جواز فراہم کرتی ہے۔ سیاسی جمہوری عمل اور معاشی سماجی چیلنجوں کے تناظر میں ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جیسا کہ مختاراں مائی نے جرگے کے حکم پر اپنے ساتھ سرعام اجتماعی زیادتی کے اپنے ذاتی تجربے پر مبنی خودنوشت In the Name of Honour (2006:123) میں گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے کہ کس طرح اکثر اوقات جائیداد کے قبضے کو ''غیرت'' کے معاملے میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ ایسا اس وقت بالخصوص ہوتا ہے، جب بے زمین کمیونٹی زمیندار بننے کی کوشش کرتی ہے یا پھر زراعت کے پیشے سے وابستہ برادریوں کے معاملے میں نظر آتا ہے جہاں خواتین زمین کی ملکیت کی وراثت میں حصے کی حقدار ہوتی ہیں۔

پاکستان میں سندھ اور پنجاب میں کاروکاری، بلوچستان میں سیاہ کاری اور شمال مغربی علاقوں میں تور۔ تور کی پر تشدد روایت میں اضافہ ہورہا ہے۔ جولائی 2004 میں پاکستانی سینٹ میں پیش کئے گئے سرکاری اعداد وشمار سے انکشاف ہوا کہ 6 سال کے دوران کاروکاری کے واقعات میں 4 ہزار خواتین (اور مردوں) کی جان لی گئی۔ اس کے بعد غیر سرکاری تنظیم لائیرز فار ہیومن رائٹس

اینڈ لیگل ایڈ (LHRLA) کے مطابق 2006 میں 1015 افراد کاروکاری کا شکار ہوئے۔ 380 کیس ایسے تھے جن میں ملزموں کو گرفتار تک نہیں کیا گیا۔ فوجداری ترمیمی ایکٹ (2004) کے تحت ''غیرت کے نام پر قتل'' کو جرم قرار دیا گیا ہے لیکن مختاراں مائی کیس میں پاکستان کا عدالتی نظام ظاہر کرتا ہے کہ ایسے جرائم کی سماجی قبولیت نے ریاستی اداروں کی روایت کی تشکیل کی ہے۔ بھارت کی شمالی ریاستوں بالخصوص ہریانہ میں کھپ پنچایتیں دیہات کے قاعدے توڑنے یا برادری کی رسوم سے بغاوت کرنے والے جوڑوں کے قتل یا سماجی بائیکاٹ کے حکم جاری کرنے میں کافی بدنام ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مذہبی بنیادوں پر استوار قبائلی قوانین کا متوازی قانونی ڈھانچہ بھی خواتین کی ان کے حقوق تک رسائی میں بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں عائلی قوانین شادیوں کی رجسٹریشن نہ کر کے ہندو خواتین کے حقوق کی ادائیگی میں امتیازی سلوک برتتے ہیں۔ بھارت خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کے خاتمے کے بین الاقوامی کنونشن (CEDAW) کے تحت پرسنل لا کے مطابق شادیوں کی رجسٹریشن یقینی بنانے کا وعدہ کر چکا ہے۔ اگرچہ ''سیکولر'' سپیشل میرج ایکٹ کی موجودگی میں رجسٹریشن لازمی نہیں ہے۔

اس معاملے میں اقلیتی حقوق کے بین الاقوامی ماہر ایسبو جرن ایڈی (2003) کے بقول ''مشترکہ شعبے'' اور ''علیٰحدہ شعبے'' کے درمیان توازن اور مصالحت کا تحرک کارفرما ہے۔ مؤخرالذکر کے تحت مخصوص بنیادی آزادیوں کی خلاف ورزی بھی کی جاسکتی ہے۔ نظریاتی طور پر یہ متوازی قانونی نظام ہائے کثرت پسندی اور جمہوری شراکت کو مضبوط کر سکتے ہیں جبکہ عملاً ان سے استحصال زدہ معاشرے یعنی اقلیتوں کے اندر۔ مثلاً دلت اور خواتین کو مطلق العنان اور غیر منصفانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غیرت کا معاملہ: روایتی قانونی رسومات اور صنفی استحصال

کھپ پنچایت (ہریانہ، بھارت)

راجو دیوی کا بیٹا سنیل لوہار خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے نہ صرف برادری کی پابندی توڑنے بلکہ ایسے گاؤں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو رشتہ دار سمجھا جاتا ہے میں شادی کرنے کی اندھی

MashalBooks.org

روایات سے بغاوت کرنے کی بھی جرأت کی۔ سنیل جو ایک دلت ہے اپنے گاؤں کی گوسین (برہمن) لڑکی سے محبت کرنے لگا۔ ساسرولی گاؤں ہریانہ کے ضلع جھاجھڑ میں واقع ہے۔ محبت کرنے کے بعد یہ دونوں گاؤں سے بھاگ گئے۔ گوسین برادری کے بڑوں نے کھپ پنچایت طلب کی جس کی سربراہی ساسرولی گاؤں کے منتخب سرپنچ نے کی۔ پنچایت نے حکم دیا کہ راجو دیوی اور اس کا خاندان 72 گھنٹے کے اندر جوڑے کو پیش کرے یا پھر ہمیشہ کیلئے گاؤں چھوڑ دے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں میں جو بھی معتوب خاندان سے سماجی تعلق رکھے گا اسے 1100 روپے جرمانہ کیا جائے گا۔ بھاگنے والا جوڑا اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں مثلہ ہونے سے بچنے کے ڈر سے واپس نہ آیا چنانچہ راجو دیوی خاندان کے 14 ارکان اور 7 بچوں سمیت گاؤں سے چلی گئی۔ معتوب خاندان کا گھر اور گزر اوقات کا دیگر سامان بھی وہیں رہ گیا۔ اس خاتون نے بتایا کہ پنچایت والوں نے ہمیں دھمکی دی ہے کہ ہم اگر گاؤں واپس آئے تو ہمیں قتل کر دیا جائے گا۔ مقامی انتظامیہ اس مظلوم خاندان کو تحفظ یا تعاون فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ راجو دیوی کو روہتک شہر میں پناہ لینا پڑی۔

برادری یا کھپ پنچایتیں دارالحکومت دہلی یا دہلی کے دیہی علاقوں، ہریانہ، مغربی اتر پردیش اور راجستھان کے ملحقہ علاقوں کی جاٹ کے آبادی والے مقامات پر متوازی انصاف کا نظام ہے۔ حالیہ عرصے کے دوران کھپ پنچایتیں غریب کش، خواتین کش اور دلت کش اقدام کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ (راجہ لکشمی 2004)

مختلف عدالتوں کے احکامات کے باوجود پولیس کی طرف سے ''غیرت کے نام پر'' کئے جانے والے ان پر تشدد جرائم سے چشم پوشی معمول ہے۔ ہریانہ کے ضلع کیتھل کے گاؤں نارورا میں پنچایت نے ایک شخص منوج کے خاندان کے سماجی بائیکاٹ کا حکم دیا جسے اس کی بیوی ببلی سمیت جون 2007 میں ان کے قریبی رشتہ داروں نے قتل کر دیا تھا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ایک ہی خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود شادی کرنے کی جرأت کی تھی۔ اگرچہ کیتھل کی سیشن کورٹ نے پولیس کو جوڑے کی عدالت سے گھر پہنچنے تک حفاظت کرنے کا حکم دیا لیکن پولیس نے انہیں راستے میں ہی گاڑی سے اتار دیا جس پر دونوں میاں بیوی مسافر بس سے روانہ ہو گئے۔ مخالفین نے انہیں بس سے زبردستی اتار کر بزور اپنی کار میں ٹھونس لیا۔ پولیس نے دونوں مقتول افراد کی چتا کسی کو بتائے بغیر جلا دی۔ لڑکی کے رشتہ دار بااثر زمیندار ہیں۔ پولیس نے ببلی کے رشتہ داروں کو تو

گرفتار کرلیا لیکن کانگریس پارٹی کے رکن گنگا رام کو کچھ نہیں کہا جس نے جوڑے کے قتل کا حکم دیا تھا۔

ہریانہ میں سماجی اصلاحات کی تحریکیں زیادہ موثر نہ ہونے کی وجہ ان کھپ پنچایتوں کے بااثر کردار کو بتایا جاتا ہے۔ بندھوا مکتی مورچہ کے بانی اور آریہ پرتندھی سبھا کے صدر سوامی اگنی ویش ان ظالمانہ کاموں کے ذمہ دار ہیں۔ جھاجھڑ کے علاقے دولینا میں 2003 میں جہاں 5 دلتوں کا مثلہ کیا گیا تھا تو اسی آریہ سماج کے رہنماؤں کی سربراہی میں پنچایت نے مبینہ قاتلوں کو اعزاز سے نوازا۔

کاروکاری (پاکستان)

کاروکاری غیرت کے نام پر قتل کی قبائلی رسم ہے جس پر پاکستان کے صوبے سندھ اور پنجاب میں عمل کیا جاتا ہے اور ایسے مردوں اور خواتین کو قتل کیا جاتا ہے جو اپنے خاندانوں کی رسوائی کے باعث بنتے ہیں۔ 1997 سے 30 مئی 2003 تک پنجاب میں کاروکاری کے 1797 جبکہ سندھ میں 910 کیس درج کئے گئے۔ ایک عورت کو شادی کے بغیر کسی مرد سے مراسم قائم کرنے پر ''کاری'' قرار دیا جاتا ہے اور موت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی مرد ملوث ہو تو اس ''کارو'' کہا جاتا ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کے ادارے بارہا خبردار کر چکے ہیں کہ کاروکاری کا شکار ہونے والی بیشتر خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی خواہاں ہوتی ہیں اور ان کا جائیداد میں حصہ بھی ہوتا ہے جو خاندان کے مرد باہر شادی کی صورت میں کھونا نہیں چاہتے۔ حکومت اور LHRLA جیسی این جی اوز کا تخمینہ ہے کہ 1998 سے 2005 کے درمیان 5015 سے زائد خواتین اس قبیح رسم کا نشانہ بنیں۔

ان جرائم میں صرف کسی مرد کی غیرت یا قتل کا معاملہ شامل نہیں بلکہ قاتلوں کیلئے معافی حاصل کرنے کی بھی قبائلی روایت موجود ہے۔ مجرموں کو بچانے کیلئے قصاص کے طور پر بیٹیاں مخالفین کے ساتھ بیاہنے کی قبائلی رسم ''ونی'' بھی موجود ہے۔ اس کو پاکستان کے حدود آرڈیننس میں تسلیم کیا گیا ہے۔ 2004 میں پنجاب کے گاؤں میروالا میں اونچی ذات مستوئی کی عزت کے خلاف جرم کی پاداش میں قبائلی پنچایت نے مختاراں مائی کے ساتھ سرعام اجتماعی زیادتی کا حکم دیا۔ مختاراں مائی کے 12 سالہ چھوٹے بھائی پر الزام تھا کہ اس نے مستوئی برادری کی 20، 22 سال کی

MashalBooks.org

لڑکی سلمٰی سے ''بات'' کی تھی۔ اگرچہ یہ بات سب جانتے تھے کہ الزام گھڑا گیا ہے لیکن مستوئی با اثر قبیلہ تھا لہٰذا گجروں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا تاہم ظلم کا شکار مختاراں مائی نے لڑائی لڑنے کی ٹھان لی اور پولیس کی مخالفت اور ہائیکورٹ کی طرف سے ٹرائل کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دینے کے باوجود سپریم کورٹ نے مجرموں کو گناہگار قرار دیا۔

عدلیہ: سرکاری اور شخصی قوانین کے درمیان کشیدگی پر مذاکرہ

بھارت میں ذاتی معاملات سے متعلق قانون سازی سے افراد کے درمیان امتیازی سلوک کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے آئین کے آرٹیکل 14 کی خلاف ورزی نہیں ہوتی اور قانون کے تحت مساوی تحفظ کی غیر مناسب اور نامعقول طریقے سے نفی نہیں ہوتی۔ بھارتی عدلیہ نے حقوق اور تحفظ کے میدان میں ''الگ شعبے'' پر اثر انداز ہوئے بغیر حقوق کے شعبے میں اپنا دائرہ کار بڑھانے کیلئے کام کیا ہے تاہم بعض تاریخی فیصلوں، مثال کے طور پر شاہ بانو کیس (1985) میں سپریم کورٹ کے ججوں کی طرف سے ''اسلامی کلچر'' پر بے تکے ریمارکس سے اکثریت کی روایات کی بنیاد پر تعصب سے صرف نظر کیا گیا۔ اس سے ''یکساں سول کوڈ'' کی تیاری کیلئے مکالمے کی تحریک کو زک پہنچی۔

عدلیہ ریلیف فراہم کر رہی ہے لیکن غیر منصفانہ قوانین کو چیلنج نہیں کر رہی

دانیال لطیفی اینڈ انور بنام یونین آف انڈیا (2001) کیس میں بھارتی سپریم کورٹ نے مسلم ویمن (پروٹیکشن آف رائٹس آن ڈائیوورس) ایکٹ 1986 کی آئینی حیثیت کا دفاع کیا ہے جو مطلقہ مسلمان خواتین کو فوجداری ضابطہ قانون کی دفعہ 125 کے تحت سابق شوہروں سے نان نفقہ نہ ملنے کی صورت میں کارروائی کی اجازت دیتی ہے۔ اس کی بجائے یہ ایکٹ ایسی کسی خاتون کی ذمہ داری پہلے اس کے رشتہ داروں اور پھر ریاست پر عائد کرتا ہے۔ تاہم عدالت نے زور دیا کہ ''مذہب سے قطع تعلق ان (خواتین کی معاشی اور مالی) مردوں کی برتری والے معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق ہر صورت میں تسلیم کئے جانے چاہئیں اور ان کا تحفظ کیا جانا چاہیئے کیونکہ ہر شہری سماجی انصاف کا حقدار ہے''۔ عدالت نے سیکشن 3 (1) کے تحت ''مناسب اور شفاف ادائیگی'' کی تشریح نو کرتے ہوئے کہا کہ اس میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ ''چنانچہ شوہر پر اس قانون

MashalBooks.org

کے تحت اپنی سابق بیوی کو باقاعدگی سے ماہانہ خرچہ دینا چاہیئے۔اس تناظر میں یہ ایکٹ آئین کی دفعہ125 کا ناگزیر حصہ ہے''۔

مسلمانوں،عیسائیوں، ہندوؤں اور سکھوں کے قبائلی قوانین کو پرانا سمجھا جاتا ہے بالخصوص جب کوئی کمیونٹی اقلیت بھی ہو۔کرسچین میرج بل2000 پر قانون سازی کیلئے عیسائیوں کو38 سال انتظار کرنا پڑا۔ یہ بل1947 کے بعد سے ایک اقلیت سے متعلق سول قوانین کو باضابطہ شکل دینے کی پہلی کوشش تھی جس پر عیسائی کمیونٹی کے کان کھڑے ہوگئے۔عبوری طور پر بمبئی ہائیکورٹ کے ایک حالیہ فیصلے کے تحت اگر شوہر بیوی پر تشدد کرتا ہے تو مسیحی خواتین کیلئے ان وجوہات کی بنیاد پر طلاق لینا ممکن ہوگیا ہے۔قبل ازیں وہ اس وقت تک طلاق نہیں لے سکتی تھیں جب تک ثابت نہ کردیں کہ شوہر نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے یا کسی غیر عورت کے ساتھ زنا کیا ہے۔

میری رائے اور قانون وراثت: عدلیہ کا جرأت مندانہ اقدام

میری رائے کیس (Mary Roy Case) 1986 میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے باپ کی جائیداد میں مسیحی خواتین کے مساوی حصے کا فیصلہ سنایا۔اس سے پہلے تک باپ کی موت کی صورت میں مسیحی بیٹی کو ٹرانکوور۔کوچین مسیحی وراثتی ایکٹ (1916) کے تحت بیٹے کے مقابلے میں ایک تہائی حصہ یا5 ہزار روپے جو بھی کم ہو ملتا تھا۔بیوی کو صرف خرچے کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔

اس کے نتیجے میں کیرالہ ریاست کے مسیحیوں کو1921 کے نسبتاً کھلے ڈھلے وراثتی ایکٹ سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔اس عدالتی فیصلے کے نتیجے میں نہ صرف مساویانہ حقوق کی فراہمی ہوئی بلکہ اس کے دورس اثرات بھی مرتب ہوئے لیکن بتانے میں آیا ہے کہ اس فیصلے کے بعد پوری دہائی کے دوران عدالتوں میں اپنے حقوق کے حصول کیلئے صرف2 درجن کیس دائر کئے گئے۔کمیونٹی کے عمائدین،حکومت اور چرچ نے مسیحی مذہبی قیادت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے عدالتی فیصلے پر عملدرآمد کی حوصلہ شکنی کی۔اس طرح مسیحی خواتین کی بہت بڑی تعداد کو نامرادی کی دلدل میں دھکیل دیا گیا۔

قوانین صرف اس صورت میں مضبوط ہوسکتے ہیں جب ادارہ یا ان قوانین کے پیچھے کھڑے ہونے والی جماعت مضبوط ہو۔ریاست جیسا کہ عدالتیں اسے پیش کرتی ہیں کا کردار نہایت اہم ہے لیکن کئی کیسوں میں ریاست اتنی مضبوط نظر نہیں آتی جتنا کہ کوئی گاؤں یا کوئی کمیونٹی ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

ریاست کے نسل یا برادری کی بنا پر غیر امتیازی سلوک سے روکنے کے قوانین کے باوجود خواتین اور چھوٹی ذاتوں کو مقامی یا مذہبی قوانین کے تحت حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں عدالتیں حدود آرڈیننس میں موجود ناانصافی کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرتیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں عدالتوں نے اسلام کے تحت خواتین کے مساوی حقوق کا حوالہ دیا لیکن عملی طور پر بین الاقوامی معیارات لاکھڑے کئے۔

پاکستانی عدلیہ: خواتین کے حقوق کا ایک فیصلہ

ہائیکورٹ نے مس حمیرا بنام ملک معظم غیاث کھوکھر ودیگر (1999) کیس میں درخواست گزار کے خلاف زنا کا فوجداری مقدمہ خارج کر دیا اور بظاہر دونوں ملزموں کے درمیان شادی کو جائز قرار دے دیا اور یہ کہا کہ قبل ازیں خاتون کی رشتہ داروں کی طرف سے دباؤ کے تحت کی جانے والی شادی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ ہائیکورٹ نے قرار دیا کہ ''آئین کی دفعہ 199 کے تحت حامل اختیارات کے تحت عدالت عالیہ ایسے کسی فوجداری مقدمے کو خارج کر سکتی ہے جو پولیس نے بدنیتی کے تحت درج کیا ہو یا وہ تفتیشی ادارے کی حدود میں نہ آتا ہو''۔

اس کے علاوہ ایک ہی شعبے میں بیک وقت کئی قوانین کی موجودگی کا مطلب یہ نہیں کہ تمام قوانین برابر ہیں یا ایک جتنی طاقت رکھتے ہیں۔ اصل باشندوں سے تعلق رکھنے والا علاقے کیلئے مخصوص قوانین کے معاملے میں.... ریاست اور مقامی آبادی میں ربط کے تناظر میں .... ریاستی قوانین عموماً بہت طاقتور ہوتے ہیں اور ریاستی حکام کی طرف سے ان کا استعمال اجتماعی مطالبات کو دبانے کیلئے کیا جاتا ہے۔ (مثال کے طور پر جنگلات کو ریاستی ملکیت قرار دینا اور جبراً اس حکم کا نفاذ کرنا)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باضابطہ قانون طاقتور بیرونی عناصر کے ہاتھوں یرغمال بن جاتے ہیں جنہیں مقامی سطح پر جائز نہیں سمجھا جاتا۔

اقلیتی حقوق کے تحفظ کا بین الاقوامی ضابطہ کار

تمام قسم کے انسانی حقوق کے قوانین کی بنیاد مساوات کا اصول ہے۔ اس کا ناگزیر حصہ بلا امتیاز سلوک کا تصور ہے جو اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ کسی بھی فرد کے حقوق کا بیرونی عوامل مثلاً نسل، جنس، زبان، رنگت، مذہب، قومیت، سماجی حیثیت، پیدائش، جائیداد اور سیاسی وابستگی کی

MashalBooks.org

بنیاد پر استحصال نہیں کیا جا رہا۔ بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے قوانین کے فریم ورک کے حوالے سے 6 معاہدے اور کنونشن موجود ہیں۔1- شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی کنونشن (ICCPR)1966۔2- معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر عالمی کنونشن (ICCPR)1966۔3- تمام قسم کے نسلی امتیاز کے خاتمے کا بین الاقوامی کنونشن (ICERD)1965۔4- خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا بین الاقوامی کنونشن (CEDAW)1979۔5- بچے کے حقوق پر بین الاقوامی کنونشن (CRC)1989 اور چھٹا کنونشن تشدد، ظلم، غیر انسانی سلوک اور بہیمانہ اقدامات کے خلاف ہے۔ جسے (CAT) کہتے ہیں۔ یہ 1984 میں منظور کیا گیا۔ انسانی حقوق کے عالمگیر ڈیکلریشن کے ساتھ مندرجہ بالا معاہدے مل کر انٹرنیشنل بل آف رائٹس بناتے ہیں جو اس بارے میں معیارات قائم کرتے ہیں جن پر اقوام عملدرآمد کرتی ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق پر عالمگیر فریم ورک مختلف کنونشنوں سے ورکنگ گروپوں اور خصوصی نمائندوں کی تعیناتی تک پھیلا ہوا ہے۔ ابتدائی طور اس کا ڈھانچہ انسانی حقوق کے قانون سے تیار کیا گیا اور اس وقت ڈیکلریشن آن دی رائٹس آف پرسنز بیلانگنگ ٹو نیشنل آر ایتھنک، ریلجیئس اینڈ لنگوئیسٹک مینارٹیز (1992) کی شکل میں موجود ہے۔ اس ڈیکلریشن کا ماخذ انٹرنیشنل کوویننٹ آن سول اینڈ پولیٹیکل رائٹس (ICCPR)[1]1966 ہے۔ یہ دنیا کا واحد بین الاقوامی معاہدہ ہے جس میں خصوصی طور پر اقلیتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے:

''ایسی ریاستیں جہاں نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیتیں موجود ہیں، ان اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اکثریتی گروہوں کے درمیان اپنی ثقافت سے لطف اندوز ہونے، مذہبی عقائد پر عمل کرنے یا اپنی زبان بولنے کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے''۔

اس ڈیکلریشن میں ''اقلیت'' کی اصطلاح میں ''قومی اقلیت'' بھی شامل کر لی گئی ہے جس کے حقوق کی ضمنی توجیہات ہیں۔ جو نہ صرف ان کی ثقافت کی ترقی اور تحفظ سے متعلق ہیں بلکہ ان کی قومی شناخت کا بھی یہ معاملہ ہے۔ ان حقوق کو افراد کے حقوق کے طور پر تشکیل دیا گیا ہے او ر ریاست کے فرائض کو اقلیتی گروپوں کے حوالے سے ریاستی فرائض سے جوڑا گیا ہے۔

MashalBooks.org

تحریری معاہدوں کے ذریعے محفوظ کئے گئے اقلیتی حقوق

آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل ون میں ''تمام افراد'' کے حقوق کو حق خودارادیت کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ ''افراد'' اور ''اقلیتوں'' کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ آرٹیکل 18 سوچ، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا تحفظ کرتا ہے اور آرٹیکل 20 حکومتوں کو پابند بناتا ہے کہ وہ قانون یا دیگر ضابطوں کے ذریعے قومیت، نسل، مذہب کی بنا پر ایسی نفرت کو روکیں جو اشتعال انگیزی، امتیازی سلوک یا تشدد کا باعث بنیں۔ آرٹیکل 22 ایسوسی ایشنز کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور اقلیتوں کی تعلیمی، ثقافتی، سیاسی اور دیگر تنظیموں کی تشکیل اور ان میں متحرک شرکت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ آرٹیکل 27 مذہبی آزادی اور زبان کے استعمال کا تحفظ کرتا ہے۔

دوسرے کنونشن (ICERD) میں نسلی امتیاز سے کچھ بڑھ کر معاملات کا احاطہ کیا گیا ہے جیسا کہ باضابطہ قانونی سکیمیں جو رنگت کی بنیاد پر امتیاز سلوک کا باعث بنتی ہیں۔ یہی آگے جا کر نسل اور قومیت کی بنا پر اقلیتوں کی عمومی معاملات سے بیدخلی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس معاہدے کی مانیٹرنگ کرنے والی کمیٹی نے اپنی مختلف دورانیوں کی رپورٹوں میں بار بار اقلیتوں کے خلاف امتیازی سلوک کا ذکر کیا ہے۔ نسل پرستی کے خلاف 2002 میں عالمی کانفرنس میں ''خونی پس منظر'' کی بنا پر نسلی امتیاز کو اپنے زیر غور لانے کا عندیہ دیا۔ اس اقدام کی بھارتی حکومت نے شدید مخالفت کی۔ بچوں کے حقوق کے فروغ اور حفاظت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے CRC کے آرٹیکل 20 میں لکھا ہے کہ بچے کے نسلی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی حقوق پر بھرپور توجہ دینا ہوگی بالخصوص ایسا کرنا اس وقت ضروری ہے جب بچہ اپنی فیملی کے گھر کے علاوہ کسی اور مقام پر مقیم ہو۔ اس کے علاوہ آرٹیکل 30 دراصل ICCPR کے آرٹیکل 27 کو آگے بڑھاتا ہے جو کسی فرد کے ثقافتی، مذہبی اور زبان بولنے کے حق سے متعلق ہے۔

قانون کی نظر میں افراد کے برابر ہونے پر زور دیتے ہوئے خواتین کے حقوق کے متعلق بین الاقوامی بل CEDAW کے آرٹیکل 2 میں ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کے امتیازی سلوک کا خاتمہ کرتے ہوئے مساوات کے اصول پر عمل کرے اور ایسے قوانین، روایات اور رسوم کا خاتمہ کرے جو خواتین کے خلاف امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ آرٹیکل 5 ریاستوں کو پابند بناتا

MashalBooks.org

ہے کہ وہ مردوں اور خواتین کے سماجی اور ثقافتی طرز عمل میں بہتری لائیں تا کہ خواتین اور مردوں کے گھسے پٹے کردار یا برتری یا کمتری کے تصور کی بنیاد پر استحصال کا خاتمہ کیا جا سکے۔

ان بین الاقوامی کنونشوں پر دستخط کرنے والے ملک ایسے قوانین متعارف کرانے کے پابند ہوں جس سے عالمی سطح پر کئے گئے وعدوں اور منظور شدہ قوانین کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ مثال کے طور پر بھارتی آئین کے آرٹیکل 51 سی میں بین الاقوامی انسانی حقوق قوانین اور معاہدوں پر عملدرآمد پر زور دیا گیا ہے۔ آرٹیکل 253 کے تحت پارلیمنٹ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ بین الاقوامی کنونشوں کے نفاذ کے لئے قانون بنائے۔ معاہدہ نیپال ایکٹ 1990 کے آرٹیکل 9 کے تحت عالمی سطح پر طے پانے والے معاہدوں کی توثیق ہونے پر وہ نیپالی قانون کا حصہ بن جاتے ہیں اور میونسپل سطح پر قانون سازی کی ضرورت کے بغیر براہ راست نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔

جہاں جنوبی ایشیا کے ممالک نے ان عالمی معاہدوں پر دستخط کئے ہیں اور ان کی توثیق کی لیکن مختلف اعلامیوں پر تحفظات بھی ظاہر کئے اور بعض کیسوں میں عالمی کنونشوں کے تمام تر مقصد کو زائل کر دیا جیسا کہ (CEDAW) کے معاملے میں نظر آیا۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیشی حکومت آرٹیکل 2 کی خود جو پابندی نہیں سمجھتی کیونکہ یہ شرعی حکومت قوانین اور قرآن وسنت سے متصادم ہے۔ آرٹیکل 5 کے معاملے میں بھارتی حکومت اعلان کرتی ہے کہ وہ ان دفعات پر عملدرآمد اس صورت میں کرے گی جب کسی کمیونٹی کے معاملات میں اس کی اجازت کے بغیر مداخلت نظر نہ آتی ہو۔ (CEDAW 1979) ۔حکومت پاکستان ظاہر کرتی ہے کہ اس کی معاہدے میں شمولیت ''اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین سے مطابقت'' سے مشروط ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں نے شکایت کے طریقہ ہائے افعال کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا۔

ان میں سے ہر بین الاقوامی معاہدے کے تحت ایک ایک کمیٹی قائم کی گئی جو مختلف ریاستوں کی طرف سے انسانی حقوق پر عملدرآمد کی ان کی ذمہ داریوں پر نظر رکھتی ہے۔ ان کمیٹیوں کو ''ٹریٹی باڈیز'' کہا جاتا ہے اور انسانی حقوق کے ماہرین ان کے ارکان ہیں۔ ان کا کام انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی انفرادی شکایات پر غور اور ان کا ازالہ کرنا ہے۔ یہ کمیٹیاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ذیلی تنظیم اکنامک اینڈ سوشل کونسل (ECOSOC) کو جوابدہ تھیں تاہم 2006 میں انسانی حقوق کونسل کی تشکیل کے بعد اب رپورٹ اس کونسل کو پیش کی جاتی ہے۔

MashalBooks.org

اقلیتی حقوق پر ورکنگ گروپ (1982) اقوام متحدہ میں اقلیتی حقوق سے متعلق واحد متحرک فورم ہے جو خودمختار ماہرین پر مشتمل ہے اور سب کمیشن فار پروموشن اینڈ پروٹیکشن آف ہیومن رائٹس کے اجلاس کے موقع پر ہر سال جنیوا میں اس ورکنگ گروپ کا بھی اجلاس ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ کے نئے ڈھانچے کے تحت انسانی حقوق پر نظر رکھنے والا مرکزی ادارہ انسانی حقوق کونسل ہے جو براہ راست جنرل اسمبلی کو جوابدہ ہوتا ہے اور اپنے ارکان کا انتخاب خود کرنے کا مجاز ہے۔ ورکنگ گروپ آن مینارٹی رائٹس کا این جی اوز سے گہرا تعلق ہے۔ 1999 تک کمیشن آن دی پروٹیکشن اینڈ پروموشن آف ہیومن رائٹس کو سب کمیشن آن پریونیشن آف ڈسکریمینیشن اینڈ پروٹیکشن آف مینارٹیز کہا جاتا تھا۔

نسل کشی کے جرم کے سدباب اور سزا پر بین الاقوامی کنونشن (CPPCG) 1948 کا دائرہ کار اقلیتی گروپوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس کنونشن کے آرٹیکل 2 میں نسل کشی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ ''یہ ایسا اقدام ہے جو کسی قومی، لسانی، نسلی یا مذہبی گروپ کو تباہ کرنے کے عزائم پر مبنی ہو''۔ ایسے اقدامات میں مخصوص گروپوں کو ہدف بنا کر اس کے ارکان کو نشانہ بنانا اس گروپ کے ارکان کو جسمانی یا ذہنی نقصان پہنچانا۔ کسی گروپ کو ضمنی یا کلی طور پر ارادتاً مٹانے کی کوشش کرنا۔ کسی گروپ کے اندر بچوں کی پیدائش روکنے کے اقدامات یا کسی گروہ کے بچوں کو جبری طور پر کسی اور گروپ کی طرف منتقل کرنا شامل ہے۔ سی پی پی سی جی کے آرٹیکل 4 کے تحت رکن ممالک کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ نسل کشی کے مرتکب افراد چاہے وہ آئینی طور پر برسر اقتدار حکمران ہوں، سرکاری عمال ہوں یا عام لوگ ہوں کو سزا دے تاہم ''نابود کرنے کا ارادہ رکھنا'' کی شق کی تشریح نسل کشی کی تشخیص کرنے کے حوالے سے کافی پریشان کن ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 2002 میں بھارتی صوبہ گجرات میں مسلمانوں کے منظم طریقے سے قتل عام کا واقعہ ہے۔

بین الاقوامی عدالت برائے جرائم (آئی سی سی) کا قیام جینوسائیڈ کنونشن کے 50 سال بعد عمل میں لایا گیا جس کے آرٹیکل 4 میں قرار دیا گیا ہے کہ ''نسل کشی سے متعلق جرائم کا ٹرائل ریاست کا ایک مجاز ٹربیونل کرے گا جہاں جرم کا انعقاد ہوا یا پھر ایسا بین الاقوامی پینل ٹربیونل سماعت کرے گا جو اس کا اختیار رکھتا ہو''۔ اس نکتے کو بین الاقوامی نظام قانون میں ''عدم موجود رابطہ'' کہا جاتا ہے۔ دی لیگ میں قائم انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس صرف ریاستوں سے متعلق

MashalBooks.org

مقدمات کی سماعت کرتی ہے اور انفرادی کیس نہیں سنتی۔ ایک ایسی بین الاقوامی عدالت جو اپنے فیصلوں پر انفرادی ذمہ داری کے ضمن میں عمل درآمد کرسکتی ہو کے قیام تک نسل کشی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مرتکب عناصر کو سزا نہیں مل سکتی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آئی سی سی اب نہ صرف نسل کشی کے معاملات دیکھتی ہے بلکہ اس کا دائرہ کار انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، سرکاری قتل، جبری انخلا، غلام بنانے، تشدد، زیادتی، جنسی طور پر مطیع بنانے، جبری گمشدگی اور نسلی امتیاز کے واقعات تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کنونشن پر جنوبی ایشیا سے صرف بنگلہ دیش نے دستخط کئے ہیں تاہم اس نے بھی اس کی ابھی تک توثیق نہیں کی۔

علاقائی فریم ورک

قانون سازی کے ذریعے تحفظ کی فراہمی کا یورپی نظام فریم ورک کے ایسے اصولوں کے فروغ میں دوررس اثرات کا حامل ہے جو قومی اقلیتوں کی ''خصوصی'' ضرورت کا ادراک کرتا ہے۔ نہ صرف افراد کے حقوق کے تحفظ کا قابل نفاذ میکانزم اور مثبت تحفظ بلکہ اقلیتوں کے اجتماعی حقوق بھی اس کا حصہ ہے۔ تنظیمی حوالے سے کونسل آف یورپ (COE)، دی آرگنائزیشن فار سیکورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ (OSLE) اور کسی حد تک یورپی یونین اس عمل میں شریک ہیں۔

کونسل آف یورپ: انسانی حقوق کے تحفظ اور بنیادی آزادیوں پر یورپی کنونشن (ECHR) 1950 تحفظ کے عالمگیر آلے کے طور پر وجود میں آیا۔ آرٹیکل 14 کو چھوڑ کر یہ قومی اقلیتوں کے معاملے کو براہ راست نہیں چھیڑتا جہاں تک قومی اقلیتوں کی خصوصی ضروریات کا تعلق ہے تو ECHR یا تو مبہم ہے یا وسیع البنیاد الفاظ کا حامل ہے۔ اس کے نتیجے میں 1993 میں ویانا میں نے کونسل آف یورپ نے ایک اندرونی کمیٹی تشکیل دی تاکہ ایسا ''پروٹوکول'' تیار کیا جاسکے جس کے تحت ''ثقافتی شعبے'' میں انفرادی حقوق کی ضمانت دی جاسکے۔ بالخصوص قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو۔

ECHR کے اقلیتوں کے حقوق پر پروٹوکول نمبر 12 (2000) میں پہلی بار امتیاز سے پاک ملک کے حق کو دیگر مخصوص آرٹیکلز سے الگ حیثیت دی گئی۔

یورپی چارٹر فار ریجنل آر مینارٹی لینگوئجز کا مانیٹرنگ سسٹم کمزور ہے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں معاہدے کے فریقوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ خود 35 جزیات (Requirements) میں

سے انتخاب کر سکتے ہیں۔

اقلیتی گروپ یورپی عدالت برائے حقوق انسانی سے ای سی ایچ آر کے آرٹیکل14 کو استعمال کر کے براہ راست رجوع نہیں کر سکتے تاہم امتیازی سلوک سے متعلق آرٹیکل14 کو ICCPR کے اقلیتی حقوق کے بارے میں دیگر کنونشن کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ICCPR کے تحت فرائض کی معاونت میں اس عدالت نے متعلقہ کنونشن میں اقلیتوں کے تحفظ کی شق نہ ہونے کے باوجود اس حوالے سے کئی شکایات کی سماعت کی۔ فریم ورک کنونشن فار پروٹیکشن آف نیشنل مینارٹیز (قومی اقلیتوں کے تحفظ کے ضابطہ کار کا کنونشن، جس کی منظوری 1994 میں دی گئی لیکن اس کا نفاذ 1998 میں ہوا) دراصل اقلیتی حقوق کے تحفظ کے حوالے سے پہلی جامع اور موثر دستاویز ہے جو تحفظ کرنے والے فریقوں کو قانونی طور پر عملدرآمد کا بھی پابند بناتی ہے۔ کونسل آف یورپ کے ارکان نے اس کے ابتدائیے میں لکھا ہے کہ:

''اس بات کا عزم کیا جا رہا ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں موجود قومی اقلیتوں کا تحفظ کیا جائے گا اور جیسا کہ یورپی تاریخ کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر ہوا ہے کہ براعظم یورپ میں استحکام، جمہوری سلامتی اور امن کیلئے قومی اقلیتوں کا تحفظ ناگزیر ہے''۔

اس کنونشن میں یہ اصول متعارف کرایا گیا کہ اقلیتی ثقافتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان کا فروغ یقینی بناتے ہوئے قانونی طور پر لازم قرار دیے گئے معیارات پر ریاست کی طرف سے عملدرآمد کیا جائے گا۔ اس میں مکمل اور موثر برابری، اقلیتی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی اور سرکاری امور میں شرکت جیسی اقدار بھی شامل کی گئیں جن کا ریاستی اداروں کے ذریعے نفاذ کیا جائے گا۔

ایف سی این ایم بھی یورپی کنونشن برائے تحفظ حقوق انسانی کا ایک متوازی آلہ ہے۔ پروٹوکول نہیں۔ FCNM خودمختار ماہرین پر مشتمل ایڈوائزری کمیٹی کے تحت کام کرتا ہے جس پر یورپی وزارتی کونسل کا کنٹرول ہوتا ہے جبکہ مئوخر الذکر کا نفاذ یورپی عدالت کرتی ہے۔ قانون سازی کے ذریعے یورپی کمیشن برائے جمہوریت (کونسل آف یورپ کا خودمختار ادارہ) کا قیام 1990 میں عمل میں آیا۔ اس کا زیادہ تر کردار آئینی معاونت فراہم کرنا ہے۔ 1991 میں وینس کنونشن نے یورپی کنونشن برائے تحفظ اقلیت کی تجویز دی لیکن دورس نتائج کی حامل اس دستاویز کی کونسل آف یورپ کی رکن ریاستوں نے منظوری نہیں دی۔

MashalBooks.org

یورپی تنظیم برائے سلامتی وتعاون (OSCE)

آرگنائزیشن فار سکیورٹی اینڈ کوآپریشن اِن یورپ کے مقاصد میں انسانی اور تعلیمی حقوق کا تحفظ اور رکن ملکوں میں جمہوری اداروں کا قیام شامل ہے۔اس ادارے کا قیام یہ ظاہر کرتا ہے کہ امن، انصاف، استحکام اور جمہوریت کیلئے قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق تسلیم کرنا اور ان کا احترام کتنا ضروری ہے۔اس کے علاوہ اعلان کوپن ہیگن میں پہلی بار تسلیم کیا گیا کہ اکثریتی آبادی کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے حقوق کیلئے ایسے اقدامات اٹھائے جائیں گے کہ اکثریت کی طرز سے اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک کا سدباب ہوسکے۔

سرکاری امورکار میں قومی اقلیتوں کو مئوثر شرکت یقینی بنانے کیلئے لونڈ سفارشات Lund Recmmendation کی منظوری 1999 میں دی گئی۔ یہ دو بڑے تصورات کے گرد گھومتی ہیں۔ مجموعی طور پر سرکاری امور میں اقلیتوں کی شرکت اور مقامی افعال کار میں ان کی خودمختاری۔

قومی اقلیتوں کیلئے ہائی کمشنر کے تقرر کی 1992 میں ہیلسنکی کانفرنس میں منظوری دی گئی کیونکہ ان دنوں نسلی بنیادوں پر تصادم کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا تھا۔اس کا مینڈیٹ 2 پہلوؤں کا حامل تھا، اول یہ کہ زیادہ نسلی تصادم والی کشیدگی پر کنٹرول کرنا۔دوم یہ کہ جس علاقے میں کشیدگی اتنی بڑھ جائے کہ ہائی کمشنر کنٹرول نہ کرسکے تو اس کی اطلاع OSCE کو دینا۔

اقوام متحدہ کے سسٹم فریم ورکس

اس کے علاوہ یونیسکو اور آئی ایل او جیسے اقوام متحدہ کے ادارے اقلیتی حقوق کے تحفظ کے بین الاقوامی فریم ورک کا حصہ ہیں۔اس وقت یونیسکو کے نسل اور نسل کشی پر ڈیکلریشن (آرٹیکل 5) اور تعلیم میں امتیاز پر کنونشن (آرٹیکل 5) موجود ہیں۔ جہاں تک بین الاقوامی تنظیم برائے محنت (آئی ایل او) کا تعلق ہے تو شکایات کے ازالے کیلئے جو طریقہ کار تیار کیا گیا ہے اس پر براہ راست حکومتیں، مزدور تنظیمیں یا ملازمین کی ایسوسی ایشن عملدرآمد کرسکتی ہیں۔اس کے علاوہ آئی ایل او کی کئی انسداد امتیازی سلوک روایات، اس کی پالیسی اور تکنیکی معاونت پر مبنی سرگرمیاں اقلیتوں کیلئے دلچسپی کی حامل ہوسکتی ہیں۔اس میں اقلیتوں کیلئے کوئی ایک بھی الگ کنونشن موجود نہیں بلکہ آئی ایل او کا کنونشن نمبر 107 اور 169 خصوصی طور پر اصل باشندوں، قبائلی افراد اور مہاجر ورکروں کا

MashalBooks.org

احاطہ کرتا ہے۔

اصل باشندوں کے حقوق

بین الاقوامی برادری کی طرف سے تیار کئے گئے کنونشن اور ڈیکلریشن کسی علاقے کے اصل باشندوں، انکے مفادات، ثقافتوں، طرز ہائے زندگی کے تحفظ اور ثقافتی بقا اور فروغ کے وسیع النظر فریم ورک فراہم کرتے ہیں۔1950 سے 1970 کے درمیان آئی ایل او نے جنوبی امریکہ کے اینڈین خطے Andean Region کے اصل باشندوں کے تحفظ کے پروگرام میں قائدانہ کردار ادا کیا۔آئی ایل او نے ''اصل باشندوں'' کی اصطلاح کو بین الاقوامی سطح پر قابل قبول بنانے میں بھی مدد کی۔

خود ملکوں میں اصل باشندوں اور نیم قبائلی افراد کے تحفظ اور ان کے وقار پر انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کا کنونشن نمبر107 (1957) اصل باشندوں کی حالت زار بہتر بنانے ان کے تحفظ اور روحانی جلا کے حوالے سے ہے۔اس کے علاوہ مقامی آبادیوں سے تعاون کیلئے بین الاقوامی سطح پر پہلا اقدام تھا۔اگرچہ مقامی افراد کو وسیع تر معاشرے میں باعزت مقام فراہم کرنے کیلئے یہ ایک اہم اقدام تھا تاہم کئی افراد کے نزدیک یہ کافی نہیں تھا۔کنونشن 107 کے بعد 1989 میں آئی ایل او کنونشن 1969 بھی سامنے آیا جس کا نام خودمختار ملکوں کے اصل اور قبائلی باشندوں سے متعلق کنونشن تھا۔کنونشن نمبر169 اصل اور قبائلی باشندوں کے طرز زندگی اور بقا کے بنیادی تصور پر استوار ہے۔ یہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اصل باشندے اور قبائلی افراد کا ان کی ترقی کے منصوبے تیار اور نافذ کرنے والے روایتی اداروں میں نمایاں کردار ہونا چاہیئے۔کونشن نمبر169 اصل باشندوں اور قبائلوں کے معاملات سے متعلق انتہائی موثر اور موجود بین الاقوامی نظام ہے۔اس میں ایسے آرٹیکل موجود ہیں جو مشاورت، شرکت، سماجی تحفظ، صحت، انسانی ترقی اور ماحولیات سے متعلق ہیں۔اصل مقامی افراد کے حقوق کے بارے میں آئی ایل او کا یہ واحد کنونشن ہے جس میں قانونی طور پر عملدرآمد کرنے کی پابندی عائد ہے۔

1992 میں اقوام متحدہ کی ماحولیات اور ترقی پر کانفرنس کے ایجنڈہ نمبر21 میں مستحکم ترقی کے عمل میں اصل باشندوں اور قبائلی افراد کے متحرک کردار کو تسلیم کیا گیا ہے۔حیاتیاتی تنوع پر کنونشن

MashalBooks.org

(1992) رکن ممالک پر زور دیتا ہے کہ وہ روایتی مقامی علمیت اور حیاتیاتی تنوع کی حفاظت اور اس کے دیرپا استعمال کا احترام کریں۔

ویانا ڈیکلریشن اور پروگرام آف ایکشن (1993) جو انسانی حقوق پر عالمی کانفرنس کے نتیجے میں وجود میں آیا بھی اصل باشندوں کے وقار اور منفرد ثقافتی شراکت کو تسلیم کرتا ہے اور عالمی برادری کی طرف سے اس ٹھوس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اصل باشندوں کی فلاح و بہبود اور دیرپا ترقی کے ثمرات تک ان کی رسائی یقینی بنائی جائے گی۔

اقوام متحدہ کے اصل باشندوں کے حقوق پر ڈرافٹ ڈیکلریشن (1993) جس کی تیاری میں اصل باشندوں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا اور جو ابھی عالمی ادارے کے پاس زیر غور ہے میں اصل باشندوں کی ان کی اپنی ترقی کے عمل میں شمولیت اپنے وراثتی اور علاقائی وسائل کے استعمال کے حوالے سے ترجیحات اور حکمت ہائے عملی کی تیاری میں ان کے حق کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اصل باشندوں سے متعلق ابھرتے خدشات نے اقوام متحدہ کو 1993 کو دنیا کے اصل باشندوں کے بین الاقوامی سال قرار دینے پر مجبور کر دیا جبکہ دسمبر 1994 سے 2014 تک کو اصل باشندوں کے عشرے کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ بھارت نے آئی ایل او کے کنونشن نمبر 107 میں دستخط کئے، بنگلہ دیش نے 1972 اور پاکستان نے 1960 میں اسے تسلیم کیا۔ جنوبی ایشیا کے کسی ملک نے کنونشن نمبر 169 پر دستخط نہیں کئے جو دراصل کنونشن نمبر 107 کو معطل کر دیتا ہے۔

ECOSOC کی طرف سے 1982 میں قائم کئے گئے اصل آبادی پر ورکنگ گروپ کی رہنمائی اس ادارے کی ذیلی تنظیم سب کمیشن برائے تحفظ اقلیت کرتا ہے۔ اس کا اجلاس ہر سال جنیوا میں ہوتا ہے لیکن اب اس کا نیا نام ذیلی کمیشن برائے فروغ و تحفظ انسانی حقوق ہے۔ ایک رضا کارانہ فنڈ کے ذریعے اس اجلاس میں اصل باشندوں کے نمائندوں کی شرکت یقینی بنائی جاتی ہے۔ سب کمیشن کے دائرہ کار میں اصل باشندوں کے حقوق سے متعلق بین الاقوامی معیارات کی تشکیل کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے۔

اصل باشندوں پر مستقل فورم کا قیام 2000 میں عمل میں لایا گیا۔ جس کا مقصد اقتصادی و سماجی کونسل کیلئے ''ایک ایسے مشاورتی ادارے کے طور پر کام کرنا ہے جس کے پاس اصل باشندوں کے معیشت، سماجی ترقی، ثقافت، ماحولیات، تعلیم، صحت اور انسانی حقوق کے متعلق ایشوز پر بحث کا

MashalBooks.org

مینڈیٹ ہو۔اس حیثیت میں مستقل فورم اس کونسل کو اقوام متحدہ کے نظام کے اندر اصل باشندوں سے متعلق سرگرمیوں اور تعاون کے فروغ کے بارے میں مشاورت فراہم کرتا ہے۔ ورکنگ گروپ کی طرح مستقل فورم کے اجلاس میں بھی مقامی افراد کے نمائندے بطور مبصر شرکت کر سکتے ہیں۔

(نوٹ بھارتی حکومت نے مستقل فورم کے قیام پر شدید اعتراضات کرتے ہوئے مؤقف اختیار کیا کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سسٹم کے اندر پہلے ہی کافی میکانزم موجود ہے اور درخواست کی کہ اس میکانزم کا ہی مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے کہا کہ اس کی ضرورت یقیناً ہے کیونکہ اقوام متحدہ کے سسٹم کے تحت محکموں اور مختلف تنظیموں کے درمیان اصل باشندوں سے متعلق ایشوز کے حوالے سے تشویش اور ان میں دلچسپی بڑھتی جارہی ہے)۔

حق خودارادیت کے اصول کا فروغ

حق خودارادیت دراصل اس اصول پر مبنی ہے کہ مغلوب ہو کر آزادیوں سے لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا۔عموماً اس فلسفے کی خبریں انقلاب فرانس کے اس نعرے سے منسلک ہیں کہ ہر قسم کی خودمختاری کا منبع لازمی طور پر ایک قوم کے اندر ہوتا ہے۔ایک قوم ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو کسی قوم کی خودمختاری کا ذریعہ بن سکیں۔اس طرح بادشاہ کی خودمختاری کی جگہ عوام نے لے لی۔ حق خودارادیت کا قانونی پہلو یہ ہے کہ لوگوں کو انفرادی یا اجتماعی طور پر باہم مل کر ایک قوم بنانے کا حق ہے۔

یہ اصول دوسری جنگ عظیم کے دوران اس وقت زیادہ ٹھوس حالت میں ابھر کر سامنے آیا جب امریکی صدر ووڈرو ولسن نے امن تجاویز میں یہ اصول بھی شامل کیا کہ ''حق خودارادیت کے سوال کا جائزہ لیتے ہوئے متفقہ آبادی کے مفادات کو حکومتوں کے دعوؤں کے برابر حیثیت دینی چاہیئے۔اگرچہ حکومتیں ہی جائزہ لینے والی ہیں''۔امریکی صدر کے اس فلسفے کے نتیجے میں مشرقی اور وسطی یورپ میں کئی ریاستیں آزادی سے ہمکنار ہوئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے عالمگیر نظام میں حق خودارادیت کے اصول کو اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قوانین برائے انسانی حقوق میں حیثیت دی گئی۔ البتہ افراد کے حق خودارادیت کیلئے بین الاقوامی قانونی روایت کو ان لوگوں سے منسلک کیا جاتا ہے جو نوآبادیاتی دور

MashalBooks.org

میں غلامی کی زندگی گزارتے رہے جیسا کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد1514(XV) میں نوآبادیاتی ملکوں اور عوام کو آزادی دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔(1960) تاہم یہ قرارداد منظور کرنے والی قوموں کے اپنے کنٹرول میں نوآبادیاتی علاقے رہے چنانچہ انہوں نے حق خودارادیت کو نوآبادیاتی عوام کا 'ایکسکلوسیو' حق نہیں قرار دیا۔جیسا کہ بعد میں ہونے والی پیشرفت سے نظر آیا کہ نوآبادیاتی نظام میں توسیع کے خاتمے کے باوجود حق خودارادیت کی اہمیت اور تعلق ختم نہیں ہوا۔

حق خودارادیت کا اصول بین الاقوامی قانون کی مختلف روایات میں بنیادی تضاد کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔خودمختاری، علاقائی سالمیت اور ریاستوں کی آزادی آج کے بین الاقوامی قانونی نظام کی بنیاد تشکیل دیتے ہیں۔البتہ لوگوں کے حق خودارادیت کا تعلق انسانی حقوق کے تمام بین الاقوامی ڈیکلریشنز اور کنونشنوں سے ہے۔

ریاستوں کی سالمیت برقرار رکھنا بین الاقوامی قانون کی ذمہ داری ہے۔البتہ ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ: اگر انسانی حقوق عالمگیر، بین الانحصار اور ناقابل تقسیم نوعیت کے حامل ہیں تو کیا قومی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کو ان لوگوں کی راہ میں حائل ہونے دینا چاہیئے جو اپنے حق خودارادیت کا ادراک رکھتے ہیں؟۔

دونوں روایات انتہائی اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ اقوام متحدہ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ لسانی، نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کرتے ہوئے اور ان حقوق کے تحفظ کیلئے عالمگیر اصولوں کو فروغ دیتے ہوئے ریاستوں کے خودارادیت اور علاقائی سالمیت کے درمیان توازن تلاش کیا جائے۔علاقائی سطح پر کونسل آف یورپ، نارڈک کونسل اور او ایس ای جیسے مختلف ممالک کے گروپ اقلیتوں کی خواہشات کا خیال رکھنے اور انہیں خودمختاری دینے یا وفاقی طرز حکومت متعارف کرانے کے اقدامات پر زور دے کر اس تضاد کو ختم کرنے پر توجہ دے رہے ہیں۔

اقلیتوں کے تحفظ کیلئے جنوبی ایشیائی فریم ورک

جنوبی ایشیا میں کئی مذہبی، لسانی، نسلی اور قومیتی اقلیتیں ''رشتہ داری کی ریاستیں'' رکھتی ہیں۔

MashalBooks.org

کشیدگی اور تصادم ان کے باہم تعلقات یعنی کمیونٹی اور ریاست، کمیونٹی کے درمیان اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کے چکر پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سری لنکا میں ہونے والے نسلی تصادم نے ریاست اور تامل کمیونٹی کے تعلقات اور سنہالہ تامل تعلقات کو متاثر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ بھارت میں تامل ناڈو کی نسلی رشتے داری ریاست پر اثرات مرتب کئے۔ یہ اثرات بالخصوص پناہ گزینوں کی بہت بڑی تعداد آنے پر شدید ہو گئے۔ کشمیر میں برپا شورش نے پاکستان، بھارت (بنگلہ دیش) میں ہندو مسلم تعلقات کے تحرک کو متاثر کیا اور ریاست کے ریاست سے تعلقات پر بھی اثرات ڈالے۔

جنوبی ایشیا کی تنظیم برائے علاقائی تعاون (سارک) واحد قابل عمل علاقائی میکانزم ہے لیکن اس کے مینڈیٹ میں ''تصادم'' کے معاملات پر غور کرنا شامل نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارک کا طریقہ کار نیم سرکاری اور این جی او اقدامات کی میزبانی پر مشتمل ہے جس نے خلیج میں اقلیتوں کی حالت زار اور علاقائی میکانزم کی ضرورت کا احاطہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک 2005 میں دہلی میں سرکاری سرپرستی میں ''سارک ممالک میں اقلیتوں کی حالت زار پر ورکشاپ'' دلچسپی کی حامل ہو سکتی ہے۔ ارکان پارلیمنٹ، سیاسی رہنماؤں اور قانونی ماہرین پر مشتمل ورکشاپ کے شرکا نے جنوبی ایشیا کی کونسل برائے اقلیت کے قیام کی سفارش کی تا کہ اقلیتوں کے حقوق کا فروغ اور تحفظ ممکن بنایا جا سکے۔

اس کے ساتھ خطے میں انسانی حقوق سے متعلق غیر سرکاری سطح پر بھی اقدامات کی میزبانی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ساؤتھ ایشیا فورم فار ہیومن رائٹس (SAFHR) بین الاقوامی سنٹر برائے نسلی مطالعہ (ICES) ساؤتھ ایشینز فار ہیومن رائٹس (SAHR) اور حال ہی میں قائم کیا گیا ساؤتھ ایشین پالیسی اینالسز نیٹ ورک (SAPANA)۔ سارک سے بار بار یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ جنوبی ایشیائی چارٹر آف ہیومن رائٹس کی منظوری دے اور ساؤتھ ایشین ہیومن رائٹس کمیشن قائم کرے۔

اقلیتی حقوق کے تحفظ کیلئے دوطرفہ اقدامات

جواہر لال نہرو۔ لیاقت علی معاہدہ (1950) اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ایک کوشش تھی، اس معاہدے کے تحت اقلیتوں کے حوالے سے پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں کی ذمہ

MashalBooks.org

داریوں کا تعین کیا گیا اور اقلیتوں سے سلوک کے بارے میں سرحد پار دلچسپی کی قانونی حیثیت تسلیم کی گئی تاہم وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کے 1951 میں قتل سے اس معاہدے کو دھچکا لگا۔

آسام میں 1947 میں قیام پاکستان سے پہلے موجود بنگالی مسلمانوں کا معاملہ اتنا سیاسی رنگ اختیار کر گیا کہ اس سے بین الریاست معاہدے 1948 اور نہرو لیاقت معاہدے 1950 کے تحت نمٹنا پڑا۔ مئوخر الذکر معاہدہ مسلمان آبادکاروں کو نسبتاً زیادہ تحفظ فراہم کرتا ہے: معاہدے کے فوراً بعد وہ لوگ جو قبل ازیں پناہ گزین تھے وہ اپنے گھروں کو واپس جانا شروع ہو گئے لیکن چونکہ یہ افراد بھارت کی 1950 کی مردم شماری کے بعد واپس آ گئے چنانچہ آسامی باشندوں نے انہیں "بنگالی درانداز" قرار دیا۔

مشرقی پاکستان کی جنگ (1971) کے دوران بھارت مشرقی پاکستان کی مسلح جدوجہد برائے حق خودارادیت کی حمایت کرنے میں ملوث رہا۔ جدوجہد کا مرکزی نکتہ بنگالی قوم پرستی تھی۔ 90 لاکھ بنگالی پناہ گزینوں کی بھارتی علاقوں میں منتقلی کے بعد بھارت کو بنگلہ دیش کی پیدائش میں دایہ کا کردار ادا کرنے کا جواز نظر آیا۔

انڈو سری لنکا اکارڈ (1987) کا مقصد سری لنکا میں نسلی تصادم پر قابو پانا اور استحکام بحال آنا تھا۔ معاہدے کا ضامن بھارت تھا اور اس کے تحت تامل ایلام عسکریت پسند گروپوں کو غیر مسلح کرنا اور صوبائی کونسلوں کیلئے اختیارات کی منتقلی کرنا تھا۔ سری لنکا کے ماہرین عمرانیات دلیل دیتے ہیں کہ "ایک غیر ملکی ایجنسی" سری لنکا کی مقتدر اشرافیہ کو اختیارات کی منتقلی کے بعض اقدامات پر دباؤ ڈالنے کے لئے ضروری تھی۔ اس معاہدے کو جنوب کے انتہائی قوم پرست گروپوں جنتا ویمکتی پیرونا ما (جے وی پی) اور لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام (ایل ٹی ٹی ای) نے مسترد کر دیا جو صف اول کے عسکریت پسند گروپ کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں بھارت کی امن فوج تامل ٹائیگرز کے ساتھ جنگ میں مصروف ہوگئی اور جنوب کی سیاسی قوتوں سے فاصلے بڑھ گئے۔ نتیجتاً بھارت کی امن فوج کو غیر آبرومندانہ انداز میں واپس آنا پڑا۔

چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں کا معاہدہ (1977) بنگلہ دیش حکومت اور خطے کے خود مختاری کے حصول کیلئے برسرپیکار گروپوں کے نمائندوں کے درمیان ہوا۔ معاہدے کیلئے بھارتی سفارتکاری نے بھی خاموش کردار ادا کیا جس سے بھارت میں پناہ گزین ہزاروں چکمہ قبائلیوں کو

اپنے علاقوں کو واپسی میں مدد ملے گی۔

اقلیتیں باغی کیوں ہیں:

نسلی پس منظر، قومیت اور شہریت یہ تمام شناختیں ہیں لیکن ان کی بنیادیں مختلف ہیں۔ کسی جمہوری ریاست میں شہریت مساوات کا ایک عضو ہے لیکن نسلی پس منظر اور قومیت کو اکثر اوقات ریاستوں کی طرف سے مساوات سے انکار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے باعث بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان اور سری لنکا کو ورثے میں ایسے علاقے ملے جو کئی قومیتوں، لسانی، مذہبی اور برادریوں پر مشتمل گروہوں کے مسکن تھے۔ ان سب کو سامراجی انتظامیہ کے دوران انتہائی سیاسی طور پر چلایا گیا اور آزادی کے بعد کی آئینی اصلاحات میں بھی یہی صورتحال برقرار رکھی گئی۔ ان ریاستوں کی جو نسلی جغرافیائی تشکیل تھی، بھوٹان اور نیپال کی بادشاہوں سمیت اس میں وہاں اکثریت پسندی اور معاملات میں شمولیت کی سیاست پروان چڑھانی چاہیئے تھی۔ اس کے برعکس ریاست کا جھکاؤ اکثریت پسندی کی طرف رہا اور ایسے حکومتی ڈھانچے کو ترجیح دی گئی جو مرکز پسند، جبر اور بڑے گروہ کی برتری کا حامل تھا۔ جنوبی ایشیا کی اکثر اقلیتوں کی صورتحال محکومانہ ہے اور انہیں کم آمدنی، اثاثہ جات کی قلت، محرومی اور خطرات کا بھی سامنا ہے۔ جہاں جنوبی ایشیا کے غریبوں کیلئے یہ پہلو عام ہے وہاں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد اسے زیادہ شدت اور نظام کے طور پر محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے اقلیتی حقوق کی خلاف ورزی کا براہ راست شاخسانہ ہیں۔

جنوبی ایشیا کی کوئی ریاست اندرونی خلفشار سے محفوظ نہیں۔ مختلف اقلیتوں، نسلی گروہوں، مذاہب، لسانی گروپوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، اصل قبائل یا گروہ اپنے سماجی، ثقافتی اور معاشی حقوق کے تحفظ اور بچاؤ کیلئے اپنی ریاستوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے مطالبات کا دائرہ مساوات سے وقار، علاقائی/خطہ جاتی خودمختاری، اپنی حکومت، حق خودارادیت اور علیٰحدگی تک پھیلا ہوا ہے۔ اپنا 'سٹیٹس کو' بچانے کیلئے جنوبی ایشیا کی مقتدر اشرافیہ نے اقلیتوں کی جمہوری خواہشات کو نظرانداز کیا اور اس فعل کو ماہر امور سیاست پی ساہادیوان نے ''نسلی عسکریت پسندی'' قرار دیا ہے۔ (1999) نتیجتاً یہ خطہ مختلف اقسام کے تصادم کی کمین گاہ بنا ہوا ہے۔

MashalBooks.org

ثقافتی اور نسلی تنوع بذات خود تصادم کا ذریعہ نہیں۔ لسانی پس منظر کے اتار چڑھاؤ کو اس کے عروج وزوال کے واضح اظہار۔ مقصد، سماجی اور معاشی عوامل سے کیا جاسکتا ہے۔ نسل پرستی کوئی بنیاد یا ناگزیر نہیں ہوتی۔ ماہر سیاسیات لیش گھئی نے مختصر الفاظ میں نسل پرستی کو ایک عمل کے طور پر بیان کیا ہے اور یہ کہ ''جب یہ (ثقافتی، مذہبی اور لسانی) نشانات سماجی انفرادیت کے معنوں میں نہیں لئے جاتے اور سیاسی عمل یا اقتدار کے کردار میں سیاسی شناخت اور مطالبات کی بنیاد بن جاتے ہیں تو نسلی انفرادیت باقاعدہ طور پر نسل پرستی میں تبدیل ہوجاتی ہے''۔ (گھئی 2000)

تصادم کا معاصر نظریہ سول تصادم کو بالعموم ''نسلی'' تصادم کے تصور میں پیش کرتا ہے اور یوں ان کا تاریخی پس منظر اور اہمیت ختم کردیتا ہے۔ سماجی ناانصافی، سیاسی طور پر اخراج اور سماجی معاشی مصائب کی تاریخ پر توجہ کو نسلی قوم پرستی کے متصادم میں تبدیل ہونے پر مرکوز کرتے ہوئے یہ سوال ابھرتا ہے کہ: اشرافیہ کی قیادت پر مبنی سیاست کی تخلیق میں لسانی وقومیتی اور ثقافتی اختلافات کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے؟۔

لسانی قومیت پرستی کو مسئلہ قرار دینے اور سیاستدانوں کی طرف سے اجتماعیت کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس بات پر غور کیا جاسکے کہ کسی تصادم کو نسلی رنگ دینے سے تصادم کی فالٹ لائنز سے طبقاتی تضادات اور گریزیت کی جڑیں وسائل، سیاسی شرکت اور مختلف ثقافتی شناخت کیلئے جدوجہد میں پیوست ہوتی ہیں۔

آئینی ڈیزائین اور ڈھانچہ

''قوموں'' اصل باشندوں اور گروہوں پر مشتمل کثیر النسلی اور کثیر الثقافتی معاشروں میں اگرچہ تعلقات تکلیف دہ اور کشیدگی کے حامل ہوں گے لیکن ان کا گہرائی سے اندازہ صرف ریاست کی نوعیت کے ڈیزائن اور اثرات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر 2006 میں عوامی انقلاب کی کامیابی کے بعد نیپال کو نیا آئین تیار کرنا پڑ گیا۔

نیپال: وہ بے دخلی کے عمل میں تبدیلی کو ادارہ جاتی شکل دینے کے چیلنج سے کیسے نمٹے؟۔ کیا اس سے اختیارات میں جناجاتیوں اور دلتوں کو بھی حصہ ملے گا؟۔ نیپال ملک میں بولی جانے والی عجیب زبانوں اور مذاہب کو کیسے تسلیم کرے گا؟۔

MashalBooks.org

بھارت: ریاست کی خودمختاری کے حوالے سے وفاقی / مرکزی اداروں کا اس صورت میں کیا کردار ہوگا جب ریاست میں شورش برپا ہوجائے جیسا کہ 2002 میں گجرات میں ہوا تھا؟۔ آپ ''امتیاز'' پیدا کرنے والے اصول مساوات جو بنیادی آزادیوں سے محرومی کی طرف لے جاتا ہے سے کیسے نمٹیں گے، جیسا کہ مثال کے طور پر مذہب کی آزادی یا تبدیلی؟ کیا برداشت، مساوات، برابری اور انصاف جیسی مثبت سماجی اقدار کی عدم موجودگی میں ایک ریاست کی سیکولرازم کی پالیسی بنائی جاسکتی ہے؟۔ کیا وہاں ''مثبت امتیازی سلوک'' کی واحد حکمت عملی ہوسکتی ہے؟۔ کیا ہم وسیع جمہوری شرکت کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟۔

بنگلہ دیش: کیا خودمختاریوں کو آئین میں بنیادی حقوق کے باب کے طور پر جگہ دینی چاہیئے یا پھر ایگزیکٹو خواہش کے مطابق قانون سازی کا تابع ہونا چاہیئے؟۔ جیسا کہ چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں کے معاہدے کے معاملے میں کیا گیا؟۔ اصل باشندوں کے حقوق اور ترقی کے برتر نظریے کے اثرات سے کیسے نمٹا جائے گا؟۔

سری لنکا: لسانی قطبیت میں ثالثی اور امن مذاکرات کو سیاسی حمایت دینے کیلئے کس قسم کا اختیارات کی شرکت کا میکانزم.....اوپر سے نیچے تک اختیارات کی تقسیم.....خودمختاری.....مؤثر ہوسکتا ہے؟۔ بنیادی آزادیوں کی خلاف ورزی سے متعلق قانون سازی کا عدالتی جائزہ لینے کا حق ہونا چاہیئے؟ جیسا کہ بھارت میں ہے لیکن سری لنکا میں نہیں ہے۔

دوبارہ جنگ کی طرف جانے سے روکنے کیلئے کسی قسم کے امن معاہدوں پر مذاکرات ہونے چاہئیں؟۔ آئینی ضمانت ملنے تک امن معاہدے کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟۔ کیا کسی معاہدے میں انسانی حقوق کا کوئی کردار ہونا چاہیئے؟۔ کیا تشدد کے سدباب کی مایوس کن خواہش میں تصادم کی اصل وجوہات سے صرف نظر کرنا چاہیئے؟۔ کیا دیرپا قیام امن کیلئے طاقت، انصاف اور انسانی حقوق کی حقیقتوں کو نظرانداز کردیا جائے؟۔ کیا ''نقائص'' سے بھرپور مذاکرات سے طے پانے والے امن معاہدے/سمجھوتے (1997 کا چٹاگانگ کا معاہدہ) کو فوجی فتح سے زیادہ معتبر سمجھنا چاہیئے (جیسا کہ مشرقی پاکستان میں 1971 میں ہوا) یا تصادم کو کچلنا بہتر ہے؟۔ (1973-77 میں بلوچستان میں آپریشن یا 1980 کے عشرے میں بھارتی پنجاب کے واقعات) ایسی چوائسز ہی تعین کریں گی کہ کوئی خطہ تصادم سے دوچار ہے یا اقلیتیں اور اصل باشندے کو خطرات لاحق ہوں گے

اور کیا سیاسی عمائدین مختلف گروہوں کو لسانی بنیادوں کے ساتھ متحرک کرنے کیلئے ان کے مسائل کو استعمال کرنے کے قابل ہوں گے؟۔ ثقافت اور ثقافتی اقدار نہیں بلکہ معاملات سے باہر رکھنا، معاشی سماجی اور ثقافتی حقوق کا استحصال اور آواز اٹھانے یا احترام دینے سے انکار تصادم کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور یہ ثقافتی.....لسانی خطوط پر استوار ہوگا۔ اقلیتی حقوق کے معاملے کی تہہ میں جمہوریت کا فقدان کارفرما ہوتا ہے۔

انسانی اور اقلیتی حقوق پر بین الاقوامی مباحث، تصادم کی صنعت کے بارے میں تصوراتی نظریات اور ترقی اور امدادی اداروں نے نسلی پس منظر کی حامل جدوجہد کی طرف رجحان کی دوبارہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یو این ڈی پی کی انسانی ترقی کی رپورٹ (2004) زیرعنوان ''آج کی متنوع دنیا میں ثقافتی آزادی'' میں معاشی اور سماجی انصاف کی بجائے اجتماعی یا ثقافتی شناختوں کے معاملات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ جس کا معاشرے میں استعمال مسلسل بڑھ رہا ہے۔ لسانی تحاریک کی تہہ میں ممکن ہے کہ سماجی اور معاشی انصاف کو اہم ایشو کی حیثیت حاصل ہو یا سیاسی معاملات میں شرکت بھی اس میں شامل ہو لیکن جیسا کہ سری لنکا میں تاملوں کے تنازعے میں نظر آیا کہ ان ایشوز کو بھی لسانی اور شناختی معنوں میں استعمال کیا گیا۔

بھارت کے سماجی ڈھانچے کو متاثر کرنے والی کئی فالٹ لائنز پر روشنی ڈالتے ہوئے بھارتی میگزین ''تہلکہ'' کے مدیر ترن تیج پال نے ان عناصر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے جو بھارت کے بانیوں کے ''نظریہ ہند'' کو اختلاف کی سیاست کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ایسے عناصر یہ دیکھنے میں ناکام ہیں کہ عظیم بانیان ہند نے متنوع، نوآبادیاتی اور جاگیردارانہ برصغیر سے ذات، مذہب، نسل، زبان اور طبقات کی سینکڑوں فالٹ لائنز عبور کر کے ''نظریہ ہند'' تخلیق کیا، یہ لوگ احمقانہ طور پر یہ فالٹ لائنز دوبارہ کھولنے کے درپے ہیں اور اس انتشار کو سمجھنے سے قاصر ہیں جو اس امر میں مضمر ہے''۔ (تیج پال2007)۔ چند ماہ بعد یکم جون2008 اور بعد میں بھارتی مسلمانوں کے چوتھے قومی کنونشن سے خطاب میں ''نظریہ ہند: چیلنج اور مقاصد'' کے عنوان سے انہوں نے اپیل کی کہ بھارتی قوم اس ''نظریہ ہند'' کی طرف واپس لوٹ جائے جو ہمارے آباؤ اجداد نے بنایا تھا۔ انہوں نے کہا ''اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہمیں اکثریت اور اقلیت کی حیثیت سے زیادہ بڑھ کر پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا''۔

MashalBooks.org

سوال یہ ہے کہ یہ روایتی ''نظریہ ہند'' گجرات یا راجستھان کے مسلمانوں، شمال مشرقی بھارت میں اصل باشندوں کے آرمڈ فورسز سپیشل پاورز ایکٹ کے تحت زندگی بسر کرنے، نرمدا ڈیم کی تعمیر سے بے گھر ہونے والے آدی واسیوں یا 13 بھارتی ریاستوں میں نکسل باڑیوں کی تحریک کے حوالے سے کتنا مؤثر ہے؟۔

سرحد کے دوسری طرف سری لنکا میں ''جنگ برائے امن'' کی عسکری کامیابی کے بعد سنہالہ بودھ اکثریت کی مطلق برتری کو بڑھاوا دینے میں نظریہ سری لنکا کے تصور میں اقلیتی آبادیوں یعنی تاملوں اور مسلمانوں کا کیا مستقبل ہوگا؟۔ ایل ٹی ٹی ای کی شکست کے بعد اقلیتی حقوق کی صورتحال کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے سری لنکا کے تجزیہ نگار جیادیوا ینگونڈا نے مشاہدہ کیا ہے کہ ''اگر لسانی تنازعے نے اقلیتی حقوق پر مباحثے سے تعلق کو کم کیا تھا کیونکہ تاملوں کی علاقائی قوم کے مطالبے نے سیاسی بحث کو ابھارا تو آج ہم کس قسم کے اقلیتی تحفظ کے فریم ورک کی امید رکھ سکتے ہیں؟ بہتری کی امید کم ہی ہے''۔

MashalBooks.org

باب دوم

ریاست کا نظریہ اور مقصد

کثیر رنگی معاشروں کیلئے سیاسی تنظیم میں جنوبی ایشیائی ریاستوں نے مختلف ماڈلوں کا تجربہ کیا ہے۔ان میں خصوصی خودمختاری کے ساتھ وفاقی طرز حکومت سے متحدہ ریاستی ڈھانچے تک، کثیر جماعتی جمہوریت سے پارٹیوں کے بغیر مطلق العنان اور فوجی حکومتوں کے قیام تک، سیکولر سے ملائیت طرز سے جمہوریہ اور بادشاہت تک کے نظام ہائے حکمرانی شامل ہیں۔ جہاں بھارت نے اقلیتی حقوق کے تحفظ کیلئے آئینی ضمانتوں پر مشتمل فریم ورک تیار اور نافذ کیا وہاں پاکستان میں آئین بذات خود امتیازی سلوک اور استحصال کا منبع ہے۔ خطے کے اقلیتی گروہوں کو امتیازی سلوک اور بے اختیاری کے تجربے کا عام سامنا ہے جس کا نتیجہ بیشتر کیسوں میں جبری زبان بندی جبکہ بعض دیگر کیسوں میں مزاحمت اور بغاوت کی شکل میں نکلا ہے۔ برتر (اکثریتی) گروپوں کے نزدیک اقلیتی حقوق ریاست کو چیلنج کر رہے ہیں۔ان کثیر النسلی ریاستوں کے قومی سلامتی کا تصور اکثریت کے تعصب پر مبنی ہے۔جیسا کہ سری لنکا یا کشمیر کے شورش زدہ علاقوں میں قائم کی گئی ''چیک پوسٹوں'' میں نسلی سیاست کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔مخصوص اقلیتوں کے خلاف عوام کا تعصب اور اشتباہ جڑ پکڑ چکا ہے اور قانون اور انصاف کے میکانزم کی فعالیت کو متاثر کرتا ہے بالخصوص ایمرجنسی قوانین کو۔اس کے علاوہ جیسا کہ اقلیتوں سے امتیازی سلوک اور انہیں معاملات سے باہر رکھنے کے جاری منظرنامے سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کا معاملہ سرحدوں کے پار تک کا ہے۔اسی ضمن میں سابق بھارتی سیکرٹری خارجہ ایس کے سنگھ نے کہا تھا کہ ''جو کچھ اتر پردیش اور بہار میں ہوتا ہے اس کے اثرات نیپال، تامل ناڈو کے واقعات کے اثرات سری لنکا اور اس

MashalBooks.org

طرح پنجاب، راجستھان، یوپی اور کشمیر کے واقعات کے اثرات پاکستان اور بنگلہ دیش میں محسوس کئے جاتے ہیں''۔ کئی نسلوں، زبانوں اور مذاہب کا باہم نیٹ ورک عمل اور ردعمل کی ایک پیچیدہ حرکیت بناتا ہے۔ اسی بنا پر ماہر عمرانیات پاپیا گھوش نے اس حرکیت کو ''یہ یرغمالی نظریہ'' (انتقام کے خوف اور مزاحمت کے خیال پر مبنی) قرار دیا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اسی پس منظر میں تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کو پاکستان کا قیام منصفانہ نظر آتا ہے۔ (گھوش 2007)۔ اس امر کا سرحد پار فرائض اور ذمہ داری کے اس ڈھانچے پر اثر پڑتا ہے جو ایسے گروہ سے متعلق ہے جو سرحد کے ایک طرف اقلیت اور سرحد پار اکثریت میں ہے سے سلوک کے حوالے سے ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ (1950) میں خصوصیت کے ساتھ اس تعلق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

عام معمول میں سرحد پار مذہبی اقلیتوں کو بین الاقوامی الریاست یا بین الگروہ کشیدگی کے ردعمل میں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ 1965 کی جنگ کے فوری بعد پاکستان نے دشمن کی جائیداد (تحویل ورجسٹریشن) آرڈر نافذ کیا جس کے تحت ہندوؤں یا پاکستان میں مقیم بھارتی قومیت کے افراد کو دشمن سمجھ کر صنعتوں، تجارتی مراکز اور زمینی جائیدادوں کو متروک قرار دے کر قومیا لیا گیا۔

جنوبی ایشیا کی تمام ریاستوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق کا باب موجود ہے جس میں تمام شہریوں کو نسل، جائے پیدائش، مذہب، ذات، رنگ، اور جنس سے قطع نظر بنیادی انسانی آزادیوں کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس ضمن میں کچھ پابندیاں بھی ہیں جو عموماً عدالتوں کی طرف سے نافذ العمل ہوتی ہیں۔ بادی النظر میں بنیادی حقوق افراد کو ریاست کی ثالثی پالیسیوں سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ مختلف حکومتوں نے انسانی اور اقلیتی حقوق کو ''قوم۔ ریاست'' کے سازی موضوع پر بین الاقوامی مباحث کے ساتھ نتھی کیا ہے۔ تاہم تاریخی حالات، مقتدر اشرافیہ کے نظریے کے مخصوص پس منظر اور انتہائی کثیر رنگی معاشروں میں عمومی لسانی پہلو کے گرد ''قوم ریاست'' کی تخلیق کی مجموعی سوچ نے خطے کی اقلیتوں کے لئے خطرات کو جنم دیا ہے۔

MashalBooks.org

پاکستان

آئین پر مبنی امتیازی سلوک

پاکستان مسلمانوں کے ملک کے طور پر معرض وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کے ریاستی نظریے کا محور یہ عقیدہ ہے کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں نتیجتاً غیر مسلم اور دیگر قومیتوں (جیسا کہ بلوچی، پشتون اور سندھی) کے لئے مضمرات سامنے آتے ہیں۔ تاریخی قرارداد لاہور (1940) میں خصوصی طور پر اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کے لئے موثر اور لازمی اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم نے اعلان کیا کہ مذہب، ذات اور نظریے کا ریاستی امور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن 1949 میں آئین ساز اسمبلی نے ''قرارداد مقاصد'' کی منظوری دی۔ س کی اسلامی خصوصیات کی بنا پر غیر مسلموں نے گہرے خدشات کا اظہار کیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ اسلام سے متصادم کوئی بھی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ یوں یہ قرارداد 1956، 1962 اور 1973 کے دساتیر کا ابتدائیہ بن گئی اور آئین میں اسلامی شقوں کی شمولیت کی راہ ہموار ہوگئی۔ سیکولر جمہوریت کے طور پر آغاز کر کے پاکستان بتدریج ملائیت ریاست بننے کے قریب پہنچ گیا۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے اور ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ آئین میں نویں ترمیم 1985 کے تحت قرآن و سنت کی تعلیمات قانون سازی اور رہنمائی کا بااثر ماخذ ہوں گی۔ قوانین سازی کا کام پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے ہوگا جبکہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی پالیسیوں کی تشکیل حکومت کرے گی۔

قیام پاکستان کے بعد مختلف ادوار میں 3 آئین تیار کئے گئے تاہم گاہے بگاہے آنے والے

MashalBooks.org

مارشل لاؤں کے باعث مخصوص دورانیوں میں آئینی آزادیاں معطل رہیں۔مثال کے طور پر1973 کا دستور اپنی 32 سالہ عمر میں ساڑھے 11 سال تک معطل رہا۔ویسٹ منسٹر طرز کی سیاست کا ایگزیکٹو طرز کی صدارت کے ذریعے نفاذ عمل میں لایا گیا۔آئین میں سہ پہلو حکومتی ڈھانچہ ہے۔قومی اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل پارلیمنٹ،صوبائی اسمبلیاں اور غیر سیاسی مقامی حکومتیں،صدر قومی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔

پاکستان میں عدلیہ کو قانون سازی پر نظر ثانی کرنے کا اختیار ہے۔تاہم آئین کی خلاف ورزی کے مقدمات میں سپریم کورٹ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے پلیٹ فارم کے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی اور جج صاحبان بھی معاشرتی تعصب کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر1993 میں احمدی کمیونٹی کی طرف سے رٹ درخواستیں دائر کرنے کی بھرمار ہوئی جن میں مئوقف اختیار کیا گیا کہ آئین کے آرٹیکل20 کے تحت مذہبی آزادی کی ضمانت کی خلاف ورزی کی جارہی ہے۔سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ ''احمدیوں کو مساویانہ حقوق دینا نقص امن کا باعث ہوگا کیونکہ اکثریت (سنی شیعہ) احمدیوں کی تحریک کو نظریاتی طور پر جارحانہ سمجھتی ہے''۔آرڈیننس XX اور پینل کوڈ دفعہ298 بی اور سی شامل کرنے سے احمدیوں کی طرف سے مذہبی سرگرمیوں کے انعقاد پر سمجھوتہ کر لیا گیا ہے۔1790 فوجداری مقدمات احمدیوں کے نماز پڑھنے،کلمہ طیبہ کا استعمال کرنے اور اذان دینے پر درج کرائے گئے۔احمدیوں نے آرڈیننس XX کو1993 میں سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔عدالت عظمی نے دفعہ298 سی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ ''کسی کو بھی اپنے مذہب کی ترویج کرتے ہوئے دوسروں کے مذہبی جذبات مشتعل کرنے کا بنیادی حق حاصل نہیں۔لہذا یہ دفعہ آئین کے آرٹیکل19،20 اور260 سے مطابقت رکھتی ہے''۔

وفاقی شریعت کورٹ کے قیام کے بعد قانون کے شعبے سے وابستہ اشرافیہ مزید مشکوک ہوگئی۔ایسے کیس بھی سامنے آئے جہاں آئین قانون اور قرآن مجید کے احکامات میں ٹکراؤ نظر آیا۔حبیب بنک لمٹیڈ بنام محمد حسین1987 اور حکیم خان بنام حکومت پاکستان1992 کیس میں سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ عدالتوں کو اس بات کا کوئی قانونی اختیار نہیں کہ وہ کسی قانون کو اس بنیاد پر غیر موثر قرار دے کہ یہ اللہ تعالی کی متعین کردہ حدود کے اندر نہیں آتا۔مجموعی طور پر مذہبی جارحیت سے متعلق مقدمات کی سماعت کی رفتار سست ہوتی ہے کیونکہ جج عدالتوں میں اسلام پسندوں کی

MashalBooks.org

موجودگی میں خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ دو مسیحیوں سلامت مسیح اور رحمت مسیح کو توہین رسالت کیس میں بری کرنے پر جج عارف اقبال بھٹی کو اکتوبر 1997 میں قتل کر دیا گیا۔

مساوات اور خصوصی حقوق

انسانی حقوق کی بین الاقوامی سطح پر بحث سے متاثر ہو کر پاکستان کے 1956 اور اس کے بعد آنے والے دساتیر میں مذہبی اقلیتوں کی آزادیوں، مساوات اور غیر امتیازی سلوک کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ آج پاکستان کی کل آبادی کا 3.3 فیصد عیسائیوں، ہندوؤں، احمدیوں، سکھوں اور پارسیوں پر مشتمل ہے۔ آئین میں مذہب اور اپنی زبان بولنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین کا آرٹیکل 20 (قانون، امن عامہ اور اخلاقیات سے مشروط مذہبی عقائد کی ترویج ان پر عملدرآمد اور تبلیغ اور مذہبی ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کی ضمانت دیتا ہے۔ آرٹیکل 21 غیر مسلموں کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ آرٹیکل 22 اپنے عقیدے کے علاوہ دیگر مذاہب کی تعلیمات لینے اور عبادت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ آرٹیکل 25 قانون کی نظر میں بچوں اور خواتین کو بھی برابر قرار دیتا ہے۔ آرٹیکل 28 لسانی گروہوں کے فروغ اور حفاظت پر زور دیتا ہے۔ آرٹیکل 36 ریاست کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کا تحفظ یقینی بنائے گی اور انہیں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں میں ان کے حصے کی نمائندگی دے گی۔

1962 کے آئین میں ترامیم کے بعد اور 1973 کے دستور کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کی کچھ نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ (مقامی حکومتوں میں بھی) لیکن یہ 10 نشستیں سیاسی جماعتوں کی طرف سے نامزدگی سے پر کی جاتی ہیں اور ان پارٹیوں کی قیادت مسلمان ہوتی ہے۔ وفاقی اسمبلی کے اقلیتی ارکان کے پاس اقلیتوں کا ویلفیئر فنڈ کے استعمال کا اختیار ہوتا ہے۔ جہاں تک لوکل باڈیز کا تعلق ہے تو یونین کونسلوں کی 26 نشستوں میں 2.....ایک مرد اور ایک عورت کے لئے۔ اقلیتوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔

ادارے

وزارت مذہبی امور نے 2002 میں اقلیتی امور ڈویژن کو ختم کر دیا۔ قومی کمیشن برائے اقلیت، اقلیتوں کی وفاقی مشاورتی کونسل، صوبائی محکمے برائے امور اقلیت، ڈسٹرکٹ کونسلز فار مینارٹیز اور

MashalBooks.org

خواتین کی حیثیت پر قومی کمیشن موثر نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس وقت کے وزیر اقلیتی امور فقیر حسین کے توہین مذہب قانون کے حوالے سے تبصرے سے ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم نے توہین مذہب (رسالت) قانون کا جائزہ لیا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کیونکہ یہ اسلامی نظریہ کونسل کو بھجوایا گیا تھا''۔

مذہبی بنیادوں پر اخراج

1: جداگانہ طرز انتخاب:

تنازع کا آغاز پہلے آئین کی ملی جلی ہیت سے ہوگیا تھا (مغربی پاکستان: جداگانہ طرز انتخاب اور مشرقی پاکستان مشترکہ طرز انتخاب) 1973 کے آئین میں دوبارہ مشترکہ طرز انتخاب کی بات کی گئی جس کے بعد ضیا الحق نے دوبارہ جداگانہ طریقہ انتخاب نافذ کر دیا۔ 2002 میں پھر مشترکہ طریقہ انتخاب متعارف کرایا گیا جس سے سیاسی طور پر تفریق کا ڈھانچہ ختم ہوگیا جس نے مرکزی دھارے کی سیاست سے اقلیتوں کو الگ کر رکھا تھا۔ اور ان سے سماجی معاشی شعبوں میں امتیاز ہو رہا تھا۔

2: ریاست کا سربراہ ایک مسلمان:

آئین کے طریقہ کار اور حلف کے الفاظ کے تحت یہ بات لازمی ہے کہ وزیر اعظم مسلمان ہو۔

3: مذہبی ٹیکس (زکوۃ وعشر):

وزارت مذہبی امور، زکوۃ وعشر اکتوبر 1974 میں قائم کی گئی۔ جنرل ضیا الحق نے عشر وزکوۃ اور دیگر مذہبی ٹیکسوں کا نفاذ کر کے اسلامی (سنی) برتری کی راہ ہموار کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن ہسپتالوں کو زکوۃ فنڈ سے امداد جاری کی جاتی ہے ان سے غیر مسلم مستفید نہیں ہو سکتے۔

4- احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا:

1973 کے آئین میں دوسری ترمیم کے تحت احمدیوں (جو خود کو مسلمان کہتے ہیں) کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ یہ آئین کی سطح پر اقلیتی کمیونٹی کے بنیادی حقوق کی پہلی خلاف ورزی تھی۔ 10 سال بعد انہیں عقیدے پر کھلے عام عمل کرنے سے روک دیا گیا۔ 1980 کی دہائی میں فوجداری قوانین میں ایسی ترامیم کی گئیں جن کے تحت بالخصوص احمدیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ دفعہ 298 اے، بی

MashalBooks.org

اور سی کے ذریعے کسی بھی فرد کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس طرح مسلمان کہلوانے سے منع کیا گیا جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہوتے ہوں۔2 ہزار سے زائد احمدیوں پر توہین رسالت کے الزام میں مقدمات درج کئے گئے۔اس کے علاوہ جب 2002 میں مشترکہ طرز انتخاب نافذ کیا گیا تو بھی احمدیوں کا سٹیٹس وہی رہا اور ان کی ووٹرلسٹ ایک رکھی گئی۔ختم نبوت کا حلف نہ اٹھانے پر انہیں عملاً الگ تھلگ کر دیا گیا۔

اسلامی نظریہ کونسل:

اس ادارے کو آئین کے آرٹیکل 228 کے تحت بنیاد فراہم کی گئی۔

6- اس آرڈیننس کے تحت ''حد'' کے مرتکب مسلمان کے خلاف غیر مسلم کی گواہی نا قابل قبول قرار دی گئی۔اس کے علاوہ غیر مسلم اور عورت کی شہادت کی شرح 1:2 رکھی گئی۔یعنی 2 غیر مسلموں یا عورتوں کی گواہی ایک مسلمان کی شہادت کے برابر قرار دی گئی۔حدود کیس کی سماعت کرنے والا جج مسلمان ہونا چاہیئے تاہم ملزم غیر مسلم ہو تو یہ شرط لازمی نہیں۔حدود آرڈیننس میں نکاح کے بغیر ہر قسم کے جسمانی مراسم کو جرم قرار دیا گیا ہے۔جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے تو زنا کو قابل سزا قرار دینے سے عیسائیوں میں تعلق کے حوالے سے سنگین پیچیدگی پیدا ہو گئی کیونکہ عیسائی مذہب میں طلاق کے لئے صرف زنا ایک قابل عمل وجہ ہے۔ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق اس وقت جیلوں میں 6 ہزار عورتیں اور بچے قید ہیں اور 80 فیصد خواتین ایسی ہیں جن پر زنا کا مقدمہ ہے۔حدود آرڈیننس کے تحت زیادتی اور زنا میں اس وقت فرق نہیں کیا جا سکتا جب تک 4 مردوں کی شہادت موجود نہ ہو۔

7- وفاقی شریعت عدالت:

اس عدالت کا قیام 1980 میں عمل میں لایا گیا۔یہ ایک طاقتور آئینی ادارہ ہے جس کے پاس کسی بھی قانون کا جائزہ لینے اور اسلامی تعلیمات سے تصادم کی صورت میں اسے منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔کسی فیصلے کی صورت میں اپیل کا حق سپریم کورٹ کے ایبلٹ شریعت بنچ کو دیا گیا ہے۔اس بنچ کا کوئی رکن غیر مسلم ہو سکتا ہے نہ کوئی غیر مسلمان وکیل اس وقت تک بنچ کے روبرو پیش ہو سکتا ہے جب تک فریق غیر مسلمان نہ ہو۔

MashalBooks.org

8- توہین مذہب قوانین:

1980 کے عشرے میں فوجداری قوانین (پینل کوڈ) میں مذہبی معاملات سے متعلق باب میں کئی ترامیم کر کے کئی نئی سزائیں متعارف کرائی گئیں۔ آرڈیننس xx1984 میں موت کی سزا رکھی گئی۔ دفعہ 295 سی سے بالخصوص غیر مسلموں اقلیتوں کو نشانہ بنایا گیا۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی ساخت میں انتہا پسند عناصر کے ہاتھ میں اپنے ذاتی مسائل کی بنا پر اقلیتوں کو ہدف بنانے کا ہتھیار آ گیا۔

9- قرارداد مقاصد:

آرٹیکل 2A شامل کر کے قرارداد مقاصد کو 1985 میں آئین کا جزو بنایا گیا اور اقلیتوں کو اپنے عقائد پر آزادانہ عملدرآمد کرنے اور ان کی ترویج کرنے کے حق سے متعلق پیرا حذف کر دیا گیا۔

آخری شق 295 سی (آگے چارٹ دیا گیا ہے) کے تحت کسی بے گناہ شخص کو اپنے ہمسائے یا کسی اور فرد کے ساتھ ''سیکولر'' خیالات کے حوالے سے تنازع پر برسوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑتا ہے۔ اس شق میں درج الفاظ ''تہمت، طعن اور اشارہ کہنا یہ یا براہ راست اور بالواسطہ'' اسے وسیع مفہوم پہناتے ہیں۔ دفعہ 295 سی کے تحت موت کی سزا ہے۔ کئی ملزموں کو مقدمے کی سماعت سے پہلے ہی قتل کیا جا چکا ہے اور جن چند افراد کو عدالتوں سے بریت ملی وہ بھی اسلام پسندوں کی طرف سے جان کے خوف سے بیرون ملک پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شروع میں دفعہ 295 سی میں موت کی بجائے عمر قید کی سزا تھی۔ 1990 میں وفاقی شریعت کورٹ نے فیصلہ دیا کہ سزائے قید اسلام کے مطابق نہیں اور اسے کوڈ سیکشن سے ختم کر دیا۔

توہین مذہب قوانین

بنیادی طور پر توہین مذہب قوانین انگریزوں نے 1885 میں تیار کئے تا کہ مذہبی نفرت کو ہوا دینے کا تدارک کیا جا سکے۔ 1927 کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد دفعہ 295 انڈین پینل کوڈ (آئی پی سی) میں شامل کی گئی۔ یہی وہ دفعہ 295 ہے جسے پاکستان پینل کوڈ میں اپنایا گیا۔ جنرل ضیا الحق نے 2 نئی شقیں بی (آرڈیننس 1982) اور سی (کریمنل لاء ترمیمی ایکٹ 1986 کے ذریعے) متعارف کرائی۔

MashalBooks.org

پاکستان پینل کوڈ میں شامل یہ چاروں مخصوص شقیں ''مذہب سے متعلق جرائم'' کے نام سے اکٹھی کی گئی ہیں۔

1- 295 کسی بھی طبقے کے مذہب کی توہین کے ارادے سے اس کی عبادتگاہ کو نقصان پہنچانا یا بے حرمتی کرنا۔

2- 1295 اے: کسی طبقے کے مذہب یا مذہبی عقیدے کی توہین کرتے ہوئے ارادتاً اور بدنیتی سے اس کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنا۔

3- 295 بی: قرآن مجید کے نسخے کی بے حرمتی کرنا۔

4- 295 سی: مقدس پیغمبر ﷺ کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کرنا۔

تحریری، زبانی یا اشارے سے حضرت محمد ﷺ کے مقدس نام کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تحقیہ کرنے، تہمت لگانے یا طعن و تشنیع کی سزا موت یا عمر قید ہوگی اور جرمانہ بھی ہوگا۔

توہین مذہب قوانین پاکستان میں نظام اور اداروں کی طرف سے مذہبی امتیاز کا بنیادی جزو ہیں۔ یہ مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھ میں اقلیتوں کے خلاف ایسا ہتھیار رہے جو وہ ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں کیونکہ پاکستان میں توہین مذہب قوانین کے تحت ایسا تقریباً ناممکن ہے کہ مقدمے کی شفاف سماعت ہو سکے۔ 2001 میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے توہین مذہب سے متعلق کیسوں کے اندراج کے طریقہ کار کو بہتر بنانے کے لئے ترمیم کی کوشش کی۔ جس کے تحت ایسا کیس عدالت میں بھجوانے سے پہلے ڈپٹی کمشنر کو معاملے کی چھان بین کرنا تھی لیکن مشرف کو احتجاجی مظاہروں کی وجہ سے یہ حکمنامہ ایک ماہ کے اندر ہی واپس لینا پڑ گیا۔

اگرچہ اس قانون کے نفاذ کے بعد سے کسی شخص کو سزا نہیں سنائی گئی (مراد اعلیٰ عدالتوں سے اپیلیں خارج ہونے تک) تاہم ہزاروں ملزم افراد کو عام شہریوں نے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا اور فوری ''انصاف'' ہوتا نظر آیا۔

فوری انصاف:

مئی 2004 میں توہین مذہب کے ملزم سیموئیل مسیح کو گلاب دیوی ہسپتال میں ٹی بی کا علاج کراتے ہوئے اس کے اپنے پولیس گارڈ نے قتل کر دیا۔ سیموئیل مسیح ساتواں شخص تھا جسے عدالت

کی طرف سے حتمی فیصلہ جاری ہونے سے پہلے بہیمانہ انداز میں ہلاک کر دیا گیا۔ پولیس کانسٹیبل فریاد نے سر پر چوٹ مار کر ہلاک کیا اور بعدازاں کہا کہ اسے امید ہے کہ سیموئیل کو قتل کر کے مجھے جنت میں جگہ ملے گی۔ ملزم فریاد کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا گیا۔ پیشے کے لحاظ سے خاکروب سیموئیل مسیح پر الزام یہ تھا کہ اس نے دارالاسلام مسجد کی چاردیواری کے ساتھ گند ڈالا تھا۔ اسے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس کی موت کے بعد مدعی امام مسجد نے کہا کہ اس کا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ سیمویل مسیح پر توہین مذہب کا مقدمہ چلایا جائے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے کہ وہ مسجد کے پاس گند نہ پھینک دے۔ (انسانی حقوق کمیشن 2004)

آئین اور پاکستان کی اقلیتیں:

1- آئین کی ہیت ایسی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اکثریت کے طور پر امتیازی حیثیت دیتا ہے جبکہ مذہبی اقلیتوں سے صرف تحفظ کا وعدہ کرتا ہے۔ آئین کی اسلامی بنیادوں پر قائم دفعات اقلیتوں کے لئے زیادہ فائدہ نہیں۔

2- وہ قوانین عملا عقیدے کی آزادی کی نفی کرتے ہیں (توہین مذہب قانون اور تعزیرات پاکستان کی شقیں جو صرف احمدیوں کو نشانہ بناتی ہیں) کو عدالتوں نے برقرار رکھا۔ ان بنیادوں پہ کہ (کوئی (احمدی) اپنے مذہب پر چلتے ہوئے دوسروں (سنی اور شیعہ مسلمانوں) کے مذہبی جذبات کو مشتعل نہیں کر سکتا سپریم کورٹ نے دفعہ 298 سی کو مذہبی آزادی کی ضمانت دینے والی آئینی دفعات سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے برقرار رکھا۔

3- غیر مسلمانوں کو تعلیمی اداروں میں واجبی سے کوٹے پر داخلہ ملتا ہے اور انہیں میرٹ پر داخلہ لینے کی اجازت نہیں۔

4- اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو اغوا کر کے جبرا اسلام قبول کرایا جاتا ہے لیکن ریاستی مشینری انہیں انصاف فراہم نہیں کرتی۔

5- اقلیتوں کی املاک مثلا عبادت گاہوں، ٹرسٹ کو اس عذر کی بنا پر قومی تحویل میں لے لیا گیا کہ ان کے مالکان بھارت ہجرت کر گئے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ صرف ان املاک کے منتظمین نے نقل مکانی کی اور کمیونٹی کے ارکان بدستور پاکستان میں ہیں۔

MashalBooks.org

6- اقلیتوں کی زندگی اور املاک کو بیرون ملک واقعات کے ردعمل میں نشانہ بنایا گیا: بابری مسجد کا انہدام اور ہندوؤں پر حملے، نائن الیون کے مسیحیوں پر حملے (ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان 2001)

قانونی تکثیریت اور صنفی امتیاز

سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے (اب خیبر پختونخوا) میں جرگہ سسٹم متوازی ماورائے عدالت روایتی طریقہ کار ہے۔ برسر اقتدار سیاستدان، انتظامی افسر اور علماء بدستور جرگہ سسٹم کی حوصلہ افزائی جاری رکھے ہوئے ہیں جرگہ کی روایات اور استعمال میں قتل پر قصاص کی رقم کی ادائیگی شامل ہے۔ یہ ایک خالصتاً منفی نظام ہے اور ''ونی'' جیسی روایت، یعنی کوئی معاملہ طے کرنے کے لئے لڑکی کو بذریعہ شادی دوسرے فریق کے حوالے کر دینا، بالخصوص خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

جاگیردارانہ جرگے

سندھ کے علاقے شکارپور میں جاگیردار جرگے منعقد کرتے ہیں اور دو متحارب خاندانوں کے درمیان تصفیے کے لئے لڑکیوں کی جبری شادی کی روایت ''ونی'' کے فیصلے دیتے ہیں۔ سندھ ہائی کورٹ کی طرف سے جرگوں پر پابندی لگانے کے باوجود 31 مئی 2005 میں تحصیل لکی غلام شاہ میں ایک شخص محمد رمضان نے اپنے کزن کو گیارہ بھینسیں واپس کرنے میں ناکامی پر جرگے میں بطور ہرجانہ اپنی 2 بیٹاں 9 سالہ ہیر اور ایک سالہ کریمہ بطور ونی دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ 7 گواہوں کی موجودگی میں محمد رمضان نے 50 روپے کے اسٹامپ پیپر پر دستخط کئے اور 3 روز کے اندر اپنی دونوں بیٹیاں دینے کا وعدہ کرلیا۔ اطلاع ملنے پر ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے ایک درخواست دائر کی جس پر سیشن کورٹ نے شادی رکوادی۔

''غیرت'' کے نام پر قتل کو ریاست کے خلاف جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ 2004 میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک بل کی منظوری دی جس کے تحت غیرت کے نام پر قتل کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہے۔ فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2004 میں کاروکاری اور بدلی صلح جیسی روایتی اور غیرت کے نام پر قتل کو جرم قرار دینے کی ایک نئی قسم متعارف کرائی۔

MashalBooks.org

سرکاری اور اعداد و شمار کے مطابق ہر سال ایک ہزار سے زائد افراد ''غیرت کے نام پر قتل کر دیے جاتے ہیں۔ ابھی تک یہ واضح نہیں کہ کیا ترمیمی قوانین کے تحت اس جرم کے مرتکب کسی شخص پر مقدمہ قائم کیا گیا ہے یا نہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں مسلسل یہ مطالبہ کرتی آ رہی ہیں کہ قانون میں تبدیلی کر کے اس شق Compoundability کا خاتمہ کیا جائے۔ جس کا مطلب ہے کہ قاتل اب بھی بچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی اسمبلی نے ''غیرت'' کے نام پر قتل کے واقعات میں ریاست کو والی بننے کے مطالبے کو بار بار مسترد کیا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے جولائی 2005 میں حسبہ بل پیش کیا۔ جس کے تحت محتسب کی زیر نگرانی انتظامیہ/عدلیہ کا متوازی نظام قائم کیا جانا تھا اور اس میں مذہبی پولیسنگ (عدالتی مداخلت سے بالاتر) قائم ہونا تھی۔ ایسے اختیارات سے عموماً خواتین اور اقلیتوں کے حقوق اور خودمختاری پر زد پڑتی ہے۔ صدر پاکستان نے یہ بل جائزے کے لئے سپریم کورٹ کو بھجوایا جس نے اس کی کئی دفعات کو غیر آئینی قرار دے دیا۔

وزارت داخلہ نے ابھی شہریت کے قوانین کی تصدیق (اور ترمیم) کرنی ہے جس سے غیر ملکی مرد سے شادی کرنے والی پاکستانی خاتون کے بچوں کو پاکستانی مردوں کے برابر پاکستانی شہریت ملنی ہے۔

لسانی اور قومیت کی بنیاد پر پہچان

وفاقی جامعیت کی خلاف ورزی

تحریک پاکستان کے ریکارڈ کا مشاہدہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بانیان پاکستان ایک ایسی نئی ریاست کا قیام چاہتے تھے جس میں صوبوں کو خودمختاری دی جانی تھی۔ 1940 کی قرارداد پاکستان میں بھی کہا گیا کہ شمال مغربی علاقوں (اب پاکستان) اور ہندوستان کے مشرقی زون پر مشتمل ملک بنایا جائے جس کا ہر حصہ خودمختار اور بااختیار ہوگا۔ پاکستان بنانے والے کئی صوبوں میں مسلم لیگی رہنماؤں نے وفاقی طرز کا نظام حکومت رائج کیا۔ بلوچ قوم پرست یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ ملک وفاقی اکائیوں یا عوام کی خواہش سے معرض وجود میں آیا تھا۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ تمام معاملات سوشل کنٹریکٹ کے تحت چلائے جائیں گے۔

MashalBooks.org

اختیارات کی مرکزیت کی کوششوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بانی اشرافیہ نے وفاقی جامعیت کو توڑا۔ تحریک پاکستان کے سیاسی مرکز یعنی وسطی اور شمال وسطی بھارت کی اردو بولنے والی اقلیت ... نے مسلم لیگ کی قیادت پر کنٹرول ہونے کے باعث نئی کثیر نسلی، کثیر لسانی ریاست کی قیادت کا دعویٰ کیا اور ایک متحدہ ریاست قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ وفاقیت سے انکار مہاجروں کی زیر ثالثی ایک لازمی اصول بن گیا۔ اس طرح لسانی، ثقافتی اور نسلی تنوع علاقائی سالمیت کیلئے ایک خطرہ بن گیا۔ جغرافیائی طور پر تقسیم 2 اکائیوں... مغربی اور مشرقی پاکستان.... کی سماجی ڈھانچے، معیشت اور ثقافت کے شعبے میں مزید تقسیم نے ایک مرکز پسند اور نمائندہ وفاقیت کے درمیان کشمکش میں مہاجروں کی بہتری والی بیوروکریسی نے پنجابیوں کی برتری والی فوج کے ساتھ مل کر وفاقی نمائندگی والے پارلیمانی نظام کی تشکیل کا کام مشکل بنا دیا۔ شمال مغربی ہندوستان کی صوبوں میں تاریخی تقسیم پر مرکزیت پسند انتظامی ڈھانچہ غالب آ گیا۔ مشرقی بنگال، سندھ، بلوچستان اور این ڈبلیو ایف پی میں شروع ہونے والی مزاحمت سے لوگوں کے جمہوری حقوق کو نقصان پہنچ رہا تھا جبکہ جمہوری جدوجہد کو فوجی طریقے سے کچلا گیا۔ ''آپ کون ہیں؟'' خان عبدالغفار خان کے بیٹے اور اے این پی کے سربراہ ولی خان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔ ''میں 6 ہزار سال پرانا پشتون، ایک ہزار سال پرانا مسلمان اور 27 سالہ پاکستانی ہوں''۔ اس ضمن میں ہونے والی سیاست سے یہ سوال ابھرا کہ کیا یہ مختلف شناختیں باہمی مکالمے کو تقویت پہنچا رہی ہیں یا تصادم اور خصوصی شناخت کی بحث میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔

اس وفاقی جامعیت میں تھوڑی سے لچک 1971 میں مشرقی بنگال کی پاکستان سے علیٰحدگی کے وقت آئی۔ 1973 کے آئین میں صوبائی ڈھانچے اور مغربی پاکستان میں صوبائی خودمختاری کے اقدامات کو بحال کر دیا گیا۔ نئی صورتحال میں وفاق کے نمائندے کے گورنر کی حیثیت محض علامتی رہ گئی۔ کاغذی طور پر تو وفاقی اور صوبائی اسمبلیاں مخصوص معاملات پر قانون سازی کرنے میں آزاد ہیں لیکن عملاً کسی تنازعے کی صورت میں وفاقی مقنّنہ کو برتری حاصل ہے۔ حقیقت میں طاقت کا ارتکاز بدستور مرکز میں ہے اور وسائل، ریونیو کی تقسیم اور عدالتی نظام کی تشکیل کا اختیار وفاق ہی کے پاس ہے۔

صوبوں کے درمیان برابری اور خودمختاری کے مطالبے کے باعث پاکستان کے لسانی نسلی

گروہوں نے خود کو ''قومیت'' قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان کا آئین ریاست کے کثیر القومی خواص کو تسلیم نہیں کرتا۔ لفظ قومیت کا مطلب یہ لیا جاتا ہے۔ ایک قوم (مسلمان) ایک عوام۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی سے لاحق تقسیم پسندوں کی دھمکیوں سے پیدا ہونے والا مرض ملکی سلامیت کیلئے خطرے کا باعث ہے۔ 1975 میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کے تحت پاکستان میں ایک سے زائد قوم کی موجودگی کی بات کرنے والے کیلئے سال قید کی سزا رکھی گئی ہے۔

گزشتہ 35 برسوں میں سے 20 سال تک ''نئے'' پاکستان میں پاکستانی فورسز اور شہریوں کے درمیان کئی فوجی تصادم (آپریشن) ہو چکے ہیں۔ اس کی جڑیں اختیارات کی تقسیم نو اور وسائل پر کنٹرول کی جدوجہد میں پیوست ہیں۔

درون خانہ نو آبادیاتی نظام

پاکستان کا آئین شاید ہی ملک کی کثیر لسانی خاصیت کی عکاسی کرتا ہو جہاں 6 بڑی اور 59 چھوٹی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پاکستان کی مردم شماری 1998 کے مطابق پاکستان کی کل آبادی کا 44 فیصد پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ 15 فیصد آبادی پشتو، 14 فیصد سندھی، 11 فیصد سرائیکی، 8 فیصد اردو اور 4 فیصد بلوچی زبان بولتی ہے تاہم آئین پاکستان میں ملک کی کثیر لسانی خاصیت کا صرف ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ آرٹیکل 251 کہتا ہے کہ ''قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کئے بغیر ایک صوبائی اسمبلی قومی زبان سے ہٹ کر صوبائی زبان کی تعلیم، فروغ اور استعمال کیلئے قانون سازی کر سکتی ہے''۔

اردو زبان کو برتر حیثیت دے کر مسلمان قوم کی ایک شناخت قائم کرنے کی کوششوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آزادی کے وقت اردو کل آبادی کے صرف 6 فیصد حصے کی مادری زبان تھی لیکن تاریخی حالات نے اس کو سرکاری سطح پر تسلیم شدہ قومی زبان کا درجہ دے دیا۔ سیاسی اشرافیہ نے بنگلہ زبان کو ''ہندو'' قرار دیا (اونچے طبقے کی زبان بدستور انگریزی رہی)۔ اردو کو ترجیح دینے کا معاملہ مہاجروں کی ثقافتی برتری سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی قوم پرستوں نے مخالفت کی اور اسے پنجابی حکمران اشرافیہ کی حکمرانی کی علامت قرار دیا۔ بنگالی دانشور طبقے نے بھی مخالفت کی۔ جنہیں کہ ماہر عمرانیات حمزہ علوی (1972) ''تنخواہ دار'' کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ زیادہ تر ملازمت

پیشہ تھے اور ریاستی خزانے سے تنخواہ وصول کرتے تھے۔ منطقی طور پر نظر آتا ہے کہ بنگالی کی جگہ اگر اردو زبان کو بنگال کی نچلی سطح پر انتظامیہ، عدلیہ، تعلیم، میڈیا یا عسکری شعبے میں رائج کیا جاتا تو اس بنگالی تنخواہ دار طبقے کو نقصان پہنچتا۔ سول سروس میں مغربی پاکستان کو برتری حاصل تھی اور 80 سے 84 فیصد ملازمتیں انہی لوگوں کے پاس تھیں۔

1971 میں مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی سے پاکستان ٹوٹنے کے بعد 1973 کے بعد کی حکومتوں نے پسماندہ علاقوں کی سول سروس میں نمائندگی یقینی بنانے کیلئے کوٹہ سسٹم متعارف کرایا۔ البتہ فوج میں بھرتی کیلئے کوٹہ سسٹم کی پالیسی نافذ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جہاں ان پالیسیوں سے سندھیوں اور بلوچوں کی خواہشات پوری ہوئیں وہاں اردو بولنے والے مہاجروں میں غصے اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ جنہیں بیوروکریسی میں روایتی طور پر اہم مقام حاصل رہا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ سندھی اور بلوچ اقوام تو کوٹہ سسٹم برقرار رکھنے کیلئے پرعزم رہیں جبکہ پنجابیوں اور مہاجروں نے اس کی مخالفت کی۔ ماہر امور سیاست محمد وسیم نے اپنی تحقیقی مقالے ''Affirmative Action Policies Pakistan'' 1997 میں نشاندہی کی ہے کہ ''سندھ بالخصوص کراچی کی طرف مہاجرین کے سیلاب کے بہاؤ سے آبادی کی حقیقتیں تبدیل ہوگئیں۔ جعلی ڈومیسائل سرٹیفکیٹوں کے اجرا سے راسخ ایکشن پالیسیوں کی ساکھ تباہ ہوکر رہ گئی''۔

اگرچہ عدالتوں نے فیصلہ سنایا کہ موجودہ کوٹہ سسٹم زائد المیعاد ہو چکا ہے، اس سسٹم کے 1973 میں نفاذ کے 20 سال بعد حکومتوں نے مجہول پالیسی اختیار کی۔ محمد وسیم لکھتے ہیں کہ اس (نواز شریف حکومت 1997) کو خطرہ محسوس ہوا کہ کوٹہ سسٹم ختم ہوا تو محروم طبقات بالخصوص سندھیوں کے غم و غصے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے تاہم پاکستان میں حکمران قوتوں کے مجمع کو مدنظر رکھیں تو امکان ہے کہ راسخ ایکشن پالیسیاں بے ضابطہ طور پر غیر موثر ہو جائیں گی''۔ (وسیم 1997)

قومیت کا سوال

مشرقی پاکستان ہو یا سندھ، قومیت کا مسئلہ زبان کے تنازعے کے ذریعے زیر بحث آیا۔ مشرقی پاکستان میں پے در پے تحریکوں کے باعث بنگالی کو دوسری قومی زبان کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ بنگالی عوام مغربی پاکستان کے نوآبادیاتی غلبے کے ہاتھوں میں بنگالی ثقافت کی بے وقعتی کو

MashalBooks.org

ایک ہتھیار سمجھتے تھے۔ پاکستان کے سیاسی نظام کو عسکری رنگ دینے سے اختلافات کی خلیج مزید وسیع ہوگئی۔ فوج میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی 10 فیصد سے کم تھی جبکہ فوج پر اخراجات 70 فیصد تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی سے وفاقیت کا سوال ابھر کر سامنے آ گیا لیکن یہ بات ثابت ہوگئی کہ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے تجربے سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا۔ ریاست نے نسلی فرقہ وارانہ اور طبقاتی تنازعات کو ''انسداد عسکریت پسندی'' کی طرز پر کچلنے کا وطیرہ اپنائے رکھا۔ اس کے علاوہ قومیت کے سوال کو ''اسلام'' کے نام پر مسترد کرنے یا دبانے کی کوشش کی لیکن یہ بدستور ایک قضیہ رہا اور مزید شدت اختیار کر رہا ہے۔

سندھی اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہونے کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ مہاجرین کی آمد سے قبل سندھیوں کی آبادی 1951 میں 73.8 فیصد تھی جو گھٹ کر 1998 میں 59.73 فیصد ہوگئی۔ سندھ اسمبلی میں سندھی ارکان مہاجروں کی بالادستی سے صوبے کو چھڑانے کی بات کرتے ہیں۔ سندھی کی صوبے کی سرکاری زبان کی حیثیت بحال کر دی گئی۔ اردو بولنے والے مہاجروں نے ان اقدامات کی مخالفت کی۔ 1972 میں لسانی فسادات نے پھر 1970 اور 1980 کے عشرے میں پر تشدد گروہی کشیدگی کے بیج بوئے۔ سندھ میں 1983 سے 1989 کے درمیان ہونے والی ''شورش'' لسانی قومیتی استعارے کی شکل اختیار کر لی لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کا تعلق جنرل ضیاالحق کی فوجی آمریت کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک سے تھا۔

وہ مہاجر جو ایک ''ماڈل اقلیت'' کے طور پر تناسب سے بڑھ کر مراعات حاصل کرتے رہے محروم اور خارج از معاملات بن گئے۔ سندھی قوم پرستوں کی بیداری، ان کی طرف سے وفاقی بیوروکریسی میں کوٹے پر نظر ثانی، مہاجروں کی صنعتوں کو قومیانے اور اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ اداروں تک رسائی کے نئے قوانین کے مطالبے سے مہاجروں میں ایک گونہ احساس محرومی پیدا ہوگیا۔ مئورخ طیب محمود (1997) دلیل دیتے ہیں کہ مراعات میں کمی محسوس کرتے ہوئے مہاجروں نے 1980 کی دہائی کے وسط میں لسانی گروہ کے طور پر اپنی تنظیم نو کے اور مواقع اور نمائندگی کیلئے بطور ''قوم'' اپنی شناخت متعارف کرائی۔ 1992 سے 1996 کے درمیان ریاست کی طرف سے مہاجر قومی موومنٹ کے خلاف تشدد سے مہاجر ''لسانیت'' مزید ابھر کر سامنے آئی۔

بلوچستان میں وہاں کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی اپنی خود مختار ''خانی'' کی منفرد تاریخ

ہے۔ اسی ورثے نے ''سرداروں'' سے تعلقات کو ڈھالا جو بلوچ معاشرے اور طرز حکمرانی پر حاوی ہے جسے پاکستان کی سول ملٹری اشرافیہ (پنجاب اور این ڈبلیو ایف پی) مشکل زدہ اور پرتشدد بنا رہی ہے۔ ناانصافی کا نکتہ نظر بلوچستان کی موجودہ سیاست میں نمایاں ہے۔ 1973 میں بھٹو کی منتخب حکومت نے بلوچستان کی مقبول منتخب حکومت برطرف کر دی (احتجاج کے طور پر صوبہ سرحد کی حکومت نے استعفٰی دے دیا)۔ سیاسی بحران مسلح شورش کی شکل میں 77-1973 میں پھٹ پڑا (جسے بائیں بازو کی زبردست حمایت بھی مل گئی) اور آزادی یا عظیم تر بلوچستان کا مطالبہ سامنے آ گیا۔ اس جدوجہد کو کچلنے کی فوج کی روایتی حکمت عملی نے بلوچستان کے بااثر طبقے کو ناراض کر دیا۔

1990 کی دہائی سے صورتحال شورش پسندی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ سیاسی اور معاشی طور پر محروم کئی بلوچ باشندے اس شورش کو پنجابی اکثریت والی فوج کے ہاتھوں صوبے کو کالونی بنانے کے خلاف دفاعی اقدام قرار دیتے ہیں۔ صوبہ پورے ملک کی قدرتی گیس کا 36 فیصد پیدا کرتا ہے لیکن اپنے استعمال کیلئے اسے 17 فیصد حصہ ملتا ہے۔ بلوچستان کو مجموعی ملکی وسائل میں سے صرف 12.4 فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ بلوچ ''قوم پرست'' تیل سے حاصل ہونے والی آمدن کی آبادی کے تناسب سے تقسیم مسترد کرتے ہیں۔ پنجاب کو ملکی وسائل میں سے 57 فیصد حصہ ملتا ہے جبکہ پاکستان کے 47 فیصد شعبے پر مشتمل بلوچستان کا حصہ صرف 6 فیصد ہے۔ بلوچستان کی محرومی اور مراعات سے دور حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کو گیس کی سہولت کیلئے ملتان اور راولپنڈی کے بعد 20 سال تک انتظار کرنا پڑا۔ بلوچ قوم پرستوں کو خدشہ ہے کہ گوادر میں گہرے پانی کی بندرگاہ تعمیر ہونے سے دیگر علاقوں کے بڑی تعداد میں لوگ یہاں منتقل ہو گے جس سے بلوچ علاقے اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو سکتے ہیں''۔ سرکاری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ صوبے میں بلوچ افراد کی آبادی 54.7 فیصد ہے جبکہ پشتون اقلیت 29 فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔

بلوچستان کا بحران سیاسی ہے۔ بلوچستان کی ترقی سے محروم اور طفیلی حیثیت سے اس تاثر کو تقویت ملی ہے کہ اس صوبے سے نوآبادی جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ آزادی سے پہلے نوآبادیاتی حکومتی ڈھانچے میں ایک نئی قوت کو مضبوط ہونے کا جواز ملا۔ یہ ''سردار'' تھے۔ پاکستانی تجزیہ نگار دلیل دیتے ہیں کہ پاکستانی حکومت صوبے میں ترقی اور سرمایہ کاری کی اپنی ذمہ داریوں سے پہلو

تہی کرنے کیلئے قبائلی ڈھانچے کو استعمال کرتی ہے۔ اپنے صوبے کے وسائل گودار پورٹ کی تعمیر اور صوبے میں چھاؤنیوں کے قیام جیسے معاملات سے صوبائی حکومت کو لاتعلق رکھا گیا۔ حتٰی کہ چاغی میں ایٹمی دھماکے کرنے کے معاملے میں بھی حسب روایت اسلام آباد کا طرز عمل 2 ستمبر کا ہے۔ ایک فوجی آپریشن جس کے تحت بلوچ قبائلی سردار نواب اکبر خان بگٹی کو بمباری کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ دوسرا یہ کہ اسلام پسندوں کو علاقائی قوم پرستوں کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ پشتون مذہبی جماعتوں کا بلوچ اپوزیشن سے مقابلہ کرایا جا رہا ہے یوں بلوچ اعتدال پسندوں کی قیمت پر پشتون اسلام پسندوں کو مضبوط کیا گیا۔

پشتون اس وقت 3 یونٹوں میں مقیم ہیں۔ ایک حصہ صوبہ سرحد، دوسرا بلوچستان اور تیسرا قبائلی علاقوں میں رہتا ہے۔ علاوہ فی الوقت پشتونوں کی ایک بڑی تعداد ان دنوں سندھ میں بھی رہتی ہے جس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پشتونوں نے بھی اپنے صوبے کی لسانی نسلی بنیاد پر شناخت کا مطالبہ کیا تھا۔ البتہ حالیہ 2 عشروں میں ایک نمایاں تعداد میں مڈل کلاس سامنے آئی ہے جس نے پشتو بیلٹ کے علاقوں میں قوم پرست تحریک کا آغاز کیا ہے۔ پشتو بولنے والوں کی بڑی تعداد فوجی اور سول بیوروکریسی میں موجود ہے اور یہ پنجابی اشرافیہ کے ساتھ معاشی اور سیاسی طاقت کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پشتون علاقوں میں مذہبی جماعتوں کے بڑھتے اثر و رسوخ سے وہاں قوم پرستی کے جذبات کی شدت گھٹی ہے۔ جہاں تک قوم پرستی کے جذبات کا تعلق ہے تو بلوچوں کی اس تحریک کو پشتون آبادی کی بہت کم حمایت ملی ہے حالانکہ 1970 کے عشرے میں بلوچوں کی شورش کی پشتونوں نے کھلے عام حمایت کی تھی۔ اس طرح شمال، جنوبی وزیرستان میں بدامنی کو بھی قوم پرستی کی تحریک سے منسلک کرنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ پشتون قوم پرستوں کی قیادت فاٹا میں فوجی آپریشن کرنے کی حامی ہے۔

پاکستان کا ایک بڑا علاقہ مثلاً وزیرستان، کافرستان، سندھ، بلوچستان کے کچے کے علاقے قبائلی طرز کے خودمختار نظام سے منسلک ہیں۔

MashalBooks.org

بنگلہ دیش

ایک مذہب اور زبان کی بالادستی

نوآبادیاتی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اس خطے کے عوام نے 1956 کے آئین پاکستان کے تحت اسلامی جمہوریہ میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ جس کے بعد بنگالی زبان اور ثقافت پر استوار ایک تند و تیز قوم پرست جدوجہد کا آغاز ہوا جو 1972 میں سیکولر جمہوریت پر مبنی بنگلہ دیشی آئین کی تشکیل پر منتج ہوئی۔ اس وقت سے بنگالی زبان و ثقافت پر استوار بنگلہ دیشی قوم پرستی اور مذہبی بنیاد پر قائم بنگلہ دیشی قوم پرستی کے درمیان کشمکش کا نتیجہ اسلامی بالادستی کی طرف رجحان کی صورت میں نکلا۔ بنگلہ دیشی سیاست کے ممتاز مبصر افشان چودھری نے (30 اگست 2006 کو ایک تبصرے میں) اس تبدیلی کو نظریاتی سے زیادہ قطبیت پر مبنی طرز حکمرانی میں ارتکاز کو قرار دیا۔ مثلاً یہ کہ اگر عوامی لیگ کا ووٹ بنک 10 ملین ہندو ووٹ پر مشتمل ہے تو بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے پاس اتنی ہی تعداد میں ملاؤں اور مریدوں کی حمایت ہوگی اور یہ صورتحال الیکشن والے دن بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ اقتدار سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس سے اقلیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ بنگلہ دیش کی مذہبی، لسانی اور نسلی اقلیتوں کی بے دخلی کی صورت میں نکلا ہے۔

''اپنی شناخت بھول جاؤ، ہم سب بنگالی ہیں''۔ یہ جواب بنگلہ دیش کے بانی وزیراعظم شیخ مجیب الرحمان نے چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں کے اصل باشندوں کے لئے خودمختاری کے مطالبہ کرنے والے مقامی رہنما مانا بندر انرائن لارما کو دیا تھا''۔

بنگلہ دیش کی نئی ریاست سیکولر طرز حکمرانی کے طور پر ابھر کر سامنے آئی جبکہ آئین میں مذہب

کو سیاست کے طور پر استعمال کرنے کی پابندی ہے۔1972 کے اصلی آئین کے 4 بنیادی اصول تھے: سیکولرازم، نیشنل ازم، جمہوریت اور سوشلزم تاہم بعد ازاں آئینی ترمیم کے ذریعے سیکولرازم کی جگہ اللہ تعالیٰ پر مطلق ایمان اور یقین کے الفاظ نے لے لی اور پہلے آئین کا آرٹیکل 12 خارج کر دیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ فرقہ واریت کی تمام اقسام کے خاتمے کیلئے سیکولرازم کے اصول کا ادراک کرنا ہوگا۔

1- ریاست کی طرف سے کسی مذہب کی حمایت میں سیاست کے استعمال کی کوئی اجازت نہیں ہوگی۔

2- سیاسی مقاصد کیلئے کسی مذہب کی تضحیک نہیں کی جائے گی۔

3- کسی مخصوص مذہب کے خلاف کوئی امتیازی سلوک اور اس کے پیروکاروں کے خلاف کارروائیوں کی اجازت نہیں ہوگی۔

4- کسی شخص کو ایسی کسی تنظیم، یونین یا ادارے کی رکنیت حاصل کرنے یا اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ممانعت ہوگی جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو یا مذہب کے حوالے سے سیاسی مقاصد رکھتا ہو۔

بنگلہ دیش نے خود کو متحدہ ریاست قرار دیا (آرٹیکل 1) اور کہا کہ بنگلہ دیش ثقافتی اعتبار سے یک نسلی ملک ہے۔ (آرٹیکل 6 اور 9)۔ اس میں بنگالی قوم کی بالادستی پر زور دیا گیا جبکہ چکمہ، مرمر، تری پورہ اور دیگر قبائلی اقوام جو کل آبادی کا ایک فیصد سے بھی کم بنتے ہیں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ آرٹیکل 9 میں بنگالی زبان اور ثقافت کی بنیاد پر بنگالی قوم پرستی کی تعریف کی گئی۔ اس کے بعد آرٹیکل 6 میں قرار دیا گیا کہ بنگلہ دیش کے رہائشی تمام افراد بنگالی کہلائیں گے۔ یوں غیر بنگالی آبادی کو نسلی اقلیتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ آرٹیکل 3 میں بنگالی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اس طرح بنگالی نہ بولنے والی یا اردو بولنے والی بہاری آبادی کو لسانی اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ آرٹیکل 2 کے تحت اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا اور ہندو، بودھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو مرکزی دھارے سے دور کر دیا گیا۔

1975 میں شیخ مجیب الرحمان کے قتل اور فوجی بغاوت کے بعد بنگالی سے بنگلہ دیشی قوم پرستی کی طرف انتقال نے نسلی گروہوں کو مزید محرومی کا شکار کر دیا۔ فوجی حکمرانوں جنرل ضیاالرحمان اور

MashalBooks.org

جنرل حسین محمد ارشاد نے ''بنگلہ دیشی قوم پرستی'' کی از سرنو تشریح کرتے ہوئے کہا کہ یہ نسل کے عناصر، جنگ آزادی، بنگالی زبان، ثقافت اور سب سے بڑھ کر مذہب پر استوار ہوگی۔ شیخ مجیب الرحمان کی زندگی میں ہی اسلام کی طرف مراجعت شروع ہو چکی تھی اور ان کی جانشین فوجی حکومتوں نے یہ تسلسل برقرار رکھا۔ ان فوجی حکومتوں نے اپنے اقتدار کو جواز فراہم کرنے کیلئے اسلامائزیشن کے عمل کو مزید آگے دھکیلا اور قرار دیا کہ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ اسی تناظر میں مقبول منتخب عوامی لیگ اور بی این پی کی حکومتوں نے بھی آئین میں امتیازی دفعات کو چھیڑنے کی سرموزحمت نہیں کی۔ ماہر عمرانیات آمنہ محسن کہتی ہیں کہ (2003:337-38) ''آنے والی حکومتوں کے ہاتھ میں آئینی دفعات برتری اور غلبے کا ہتھیار بن کر رہ گئیں''۔

بنگلہ دیشی آئین شہریوں کے بنیادی حقوق تسلیم کرتا ہے اور قانون کے سامنے برابری اور غیر امتیازی سلوک کی ضمانت دیتا ہے (آرٹیکل 27 اور آرٹیکل 28)۔ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے شہریوں کو آرٹیکل 41 کے تحت تسلیم کیا گیا ہے۔ جو شہریوں کو اپنے عقیدے پر عمل کرنے اور اس کی ترویج کی اجازت دیتا ہے۔ اس آرٹیکل کی دیگر شقوں میں ہر شہری کو کسی مذہب سے لاتعلقی یا اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کی تعلیم حاصل کرنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے تاہم سیاسی حقیقتیں اس کے برعکس ہیں۔ جہاں کہیں فرقہ وارانہ کشیدگی سامنے آتی ہے تو اکثر اوقات ریاست غیر جانبدار فریق کا کردار ادا کرتی ہے اور اقلیتوں کے تحفظ کی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتی ہے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس میں اقلیتی اور انسانی حقوق گروپ آئینی ضمانتوں کو اقلیتوں کے تحفظ سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

آئین اقلیتوں کو بنگالیوں سے ہٹ کر کوئی گروہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ ''سب افراد بنگلہ دیشی ہیں، ایک زبان، ایک مذہب ایک نسل''۔ لسانی اعتبار سے 98 فیصد افراد بنگالی زبان بولتے ہیں اور 90 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ آرٹیکل 17 ایک ایسا یکساں نظامی تعلیم رائج کرنا چاہتا ہے جو ''اعلیٰ'' بنگلہ مسلم کلچر کو فروغ دے اور یوں اقلیتوں کی ثقافت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جماعت اول سے ہشتم تک اسلامیات کو بطور لازمی مضمون شامل کیا گیا ہے البتہ اقلیتوں کو اسی طرح اپنے مذہب سے متعلق کورس منتخب کرنے کی بھی اجازت ہے۔ ریاست کی طرف سے عیسائیوں، بودھوں یا ہندوؤں کے سکولوں کو کوئی فنڈ فراہم نہیں کیا جاتا۔

MashalBooks.org

بنگلہ دیش میں وزارت اقلیتی امور ہے جس میں 3 غیر مسلم ویلفیئر ٹرسٹ شامل ہیں۔ان میں ہندو، بودھ اور مسیحی اقلیتوں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

آدی واسیوں کا تحفظ

بنگلہ دیش یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی سرزمین پر کوئی اصل باشندے موجود ہیں۔مغرب میں پہاڑی باشندے اور جنوب مشرق میں میدانی علاقے کے قبائل مل کر مجموعی آبادی کا 1.13 فیصد بناتے ہیں۔1997 کے چٹا گانگ کی پہاڑی ترائیوں کے باشندوں کے ساتھ معاہدے میں اس کو ''قبائلیوں کے زیر قیام علاقہ'' قرار دیا گیا۔معاہدے پر دستخط کرنے والی شیخ حسینہ واجد کی حکومت نے ان کیلئے آدی واسی کا لفظ استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔صرف اس مثال سے اصل باشندوں کی موجودگی تسلیم کرنے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔چکمہ قبیلے کے چٹا گانگ کے علاقے میں سردار اور بیرسٹر دیواشیش (رائے2002) کہتے ہیں کہ آدی واسیوں کی آئین میں شناخت سے انکار کیا گیا ہے۔

آئین کے واحد آرٹیکل 28 میں جو اقلیتوں کے حقوق کا کسی حد تک حوالہ دیتا ہے میں کہا گیا ہے کہ ''ریاست کی راہ میں خواتین اور بچوں یا شہریوں کے کسی پسماندہ طبقے کی ترقی کے اقدامات میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بننی چاہیئے'' تاہم اس میں واضح نہیں کیا گیا کہ ''پسماندہ'' کی تعریف میں کون کون آئے گا۔بنگلہ دیش نے آئی ایل او کے کنونشن نمبر107 (1957) پر دستخط کئے ہیں لیکن کنونشن نمبر169(1989) پر دستخط نہیں کئے جو اصل باشندوں کے بارے میں ہے۔اس کنونشن میں مشترکہ حقوق اراضی، قدرتی وسائل اور نقل مکانی سے متعلق حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔بنگلہ دیش نے لسانی گروہوں کے روایتی حقوق کیلئے خصوصی قانون سازی نہیں کی۔

چٹا گانگ ہل ٹریکٹس ریجن کی آئینی حیثیت کو چٹا گانگ ہل ٹریکٹس (ریگولیشن) مینوئل 1900 اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ1935 کے ذریعے باضابطہ شکل دی گئی ہے اور پہلے اسے پسماندہ پہاڑی ترائیاں قرار دیا گیا تھا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کو''مکمل خارجی علاقہ'' قرار دیا گیا تھا۔جس میں روایتی سرداروں کی خودمختاری انتظامی حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اسے منفرد قانونی نظام دیا گیا اور بیرونی افراد کی وہاں آبادکاری ممنوع قرار دی گئی۔1956 کے

MashalBooks.org

آئین میں اس کی خارجی حیثیت برقرار رکھی گئی لیکن اسے براہ راست مرکز یا گورنر کی زیر نگرانی لایا گیا۔1962 کے آئین میں اس کی ''قبائلی علاقے'' کی حیثیت میں تبدیلی کر دی گئی اور1963 کی ترمیم میں اس کی خودمختاری ختم کر کے ''بیرونی باشندوں'' کے یہاں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔اس کا نتیجہ بڑی مقدار میں غیر آبادکاری اور نقل مکانی کی صورت میں نکلا، بالخصوص کپتائی ڈیم بننے اور 40 فیصد سے زائد قبائلی اراضی زیر آب آنے کی وجہ سے چٹا گانگ کے اصل باشندوں کے سوا غیر مقامی افراد کی آبادکاری کیلئے ضلع کمشنر کی اجازت سے متعلق قاعدہ نمبر34 ختم کر دیا گیا۔اس علاقے کی خصوصی حیثیت میں کمی سے یہاں اجنبی افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ریاست کی مدد سے یہاں 4 لاکھ بنگالیوں کو آباد کیا گیا۔1964 سے چٹا گانگ کی پہاڑی ترائیوں کی خصوصی انتظامی حیثیت کو ابھی تک آئینی توثیق نہیں دی جا سکی۔

علاقے کی خصوصی حیثیت کی آئینی توثیق کی عدم موجودگی کے مضمرات کا اندازہ مصطفٰی انصاری بنام ڈپٹی کمشنر ہل ٹریکٹس وغیرہ کیس سے ہوتا ہے۔ڈھاکہ ہائیکورٹ نے چٹا گانگ ریگولیشن1900 کے قاعدہ51 کو غیر آئینی قرار دے دیا جو ڈپٹی کمشنر کو ایسے کسی غیر مقامی شخص کی بے دخلی کا اختیار دیتا تھا جو مقامی امن وسلامتی کیلئے خطرہ ثابت ہو۔

بنگلہ دیشی ریاست کی طرف سے پہاڑی قبائل کے حقوق اور ثقافتی شناخت سے انکار کے نتیجے میں 25 برس کے دوران مسلح جدوجہد نے جنم لیا۔1997 کے معاہدے میں اس علاقے کو قبائلیوں کے مسکن کے طور پر تسلیم کیا گیا لیکن اس معاہدے کی بذات خود کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے۔چٹا گانگ کی پہاڑی ترائیوں (سی ایچ ٹی) کی خصوصی حیثیت کی بحالی کا اصل باشندوں کی طرف سے مطالبہ مسلسل جاری ہے۔1990 میں اعلان رنگامتی میں بھی اس کا مطالبہ کیا گیا۔

میدانی علاقوں کے قبائل کو انگریز دور کے قانونی ورثے چھوٹا ناگ پور ٹینینسی ایکٹ 1908 کے تحت تحفظ حاصل ہے۔جو ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر کوئی مقامی اراضی غیر مقامی افراد کو فروخت کرنے سے منع کرتا ہے۔حکومت اصل باشندوں کے روایتی قبضے میں زمینوں کو خصوصی میعادی حیثیت دیتی ہے اور اس مقصد کیلئے مقامی قبائلیوں کی ذاتوں کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس قانون میں اصل باشندوں کی تعریف نہیں کی گئی۔علاوہ ازیں یہ نسلی گروہ اپنے حقوق کو تحفظ دینے والے قوانین سے بھی آگاہی نہیں رکھتے۔اسی لئے سنتھل، گیرو اور بھیل قبائلیوں کو اپنی

MashalBooks.org

اراضی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ لوگ ریاست کی طرف سے کمرشل جنگلات اور نیشنل پارکس کے فروغ کی پالیسی نشانہ بنے۔ اس کے علاوہ ویسٹڈ پراپرٹی ایکٹ جیسے قوانین اور بنگالی لینڈ رجسٹریشن کے اہلکاروں کی ملی بھگت سے زمینوں کے متلاشی بنگالی آبادکار مقامی آبادیوں کی غیر آبادکاری کا باعث بنتے رہے ہیں۔

سیاسی نمائندگی

نسلی گروہوں کیلئے کوئی نشستیں مخصوص نہیں اگرچہ چٹا گانگ کیلئے 3 سیٹیں موجود ہیں لیکن بنگالی آبادکار بھی ان نشستوں کیلئے اہل ہیں۔

ادارے

وزارت برائے امور چٹا گانگ ہل ٹریکٹس قائم کی گئی ہے لیکن اس نے اختیارات کی تقسیم کے مجوزہ ڈھانچوں پر ریاستی کنٹرول کو مضبوط کیا ہے اور یوں خودمختاری کی خواہشات کو نقصان پہنچا ہے۔

امتیازی دفعات اور قوانین:۔

مذہبی دفعات:۔

1977 کے آرڈر نمبر1 کے تحت آئین کے ابتدائیے سے پہلے بسم اللہ الرحمان الرحیم متعارف کرائی گئی۔ سیکولرازم کو بطور اصول ریاست خارج کر دیا گیا۔ سوشلزم کو معاشی اور سماجی انصاف تک محدود کر دیا گیا۔

بنگلہ دیشی قوم پرستی:

آئین میں پانچویں ترمیم کے تحت بنگالی قوم پرستی سے بنگلہ دیشی قوم پرستی کی طرف مراجعت کی گئی۔ (آرٹیکل 6)

اسلام ریاست کا مذہب:۔ آٹھویں ترمیم (1988) کے تحت اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ (آرٹیکل 2)

فرقہ بندی پر مبنی جماعتیں: آرٹیکل 12 جو فرقہ بندی پر مبنی سیاسی جماعتوں کے قیام پر پابندی لگاتا تھا خارج کر دیا گیا۔

MashalBooks.org

قومی زبان:۔

آرٹیکل 23 ریاست پر زور دیتا ہے کہ وہ عوام کی ثقافت اور ورثے کو محفوظ بنائے تا کہ قومی زبان کو فروغ مل سکے.....اور قومی ثقافت کو استحکام مل سکے۔ بنگالی اکیڈمی تو قائم کی گئی ہے لیکن دیگر نسلی گروہوں کی ثقافت کے لئے کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔

ویسٹڈ پراپرٹی ایکٹ 1974:

(2001 میں ختم کر دیا گیا) یہ ایکٹ غیر منقسم پاکستان کے اینیمی پراپرٹی ایکٹ (1965) کا تسلسل تھا جو ہندوؤں اور دیگر نسلی گروہوں کے خلاف غیر منصفانہ طور پر استعمال کیا گیا۔ اس قانون میں پاکستان میں قیام پذیر بھارتی باشندوں یا بھارت میں مقیم پاکستانیوں کو ''دشمنان پاکستان'' قرار دیا گیا۔ بالخصوص اس قانون سے ہندوؤں کے زیر قبضہ املاک کی ملکیت غیر محفوظ بنا دی گئی کیونکہ اس ملکیت کو کئی سطحوں پر ثابت کرنا پڑتا تھا۔ اسے صنعتی اور دیہی املاک دونوں کیلئے بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ مقامی افسران اور قانون نافذ کرنے والے ادارے زمین کے مقدمات میں اقلیت کے خلاف اکثریت کا ساتھ دیتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق 30 فیصد ہندو املاک اس قانون کی آڑ میں ''قانوناً'' نگل لی گئی۔ بعد ازاں شیخ حسینہ واجد کی حکومت نے یہ قانون واپس لے لیا۔

ویسٹڈ پراپرٹی ریٹرن ایکٹ:

یہ قانون اپریل 2001 میں واپس لیا گیا۔ قومیائی گئی املاک کی واپسی کے دعوے دائر کرنے کیلئے 90 یوم کی میعاد مقرر کی گئی تاہم 2002 میں ایک ترمیمی ایکٹ کے تحت حکومت کو مقبوضہ املاک کی واپسی کیلئے لامحدود وقت دے دیا گیا ہے۔

تبدیلی مذہب۔ سماجی مزاحمت:

یہ قانون کسی کو عقیدے کی تبدیلی کی اجازت دیتا ہے نہ روکتا ہے۔ البتہ مقامی حکمران اور کمیونٹی اسلام سے کسی اور مذہب میں تبدیلی کی کوششوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

قانونی کثیر پسندی:

شریعت کا باضابطہ طور پر نفاذ نہیں کیا گیا۔ 2001 میں ہائیکورٹ نے تمام قسم کے فتوؤں کو غیر

MashalBooks.org

قانونی قرار دے دیا۔ فتویٰ جات میں رویت ہلال، شادی اور طلاق، غیر اخلاقی حرکات پر سزائیں اور دیگر مذہبی معاملات پر فیصلے شامل ہوتے ہیں۔ اسلامی روایات کے تحت صرف مذہبی سکالر (مفتی) ہی فتویٰ جاری کر سکتے ہیں۔

شادی طلاق اور متبنیٰ بنانے سے متعلق عائلی قوانین متعلقہ شخص کی فقہ کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ مختلف عقائد کے افراد کے درمیان شادی پر کوئی پابندی نہیں لیکن عائلی قوانین ہندو عورتوں کی شادی سے متعلق غیر فائدہ ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر شادیوں کی رجسٹریشن نہ کرنے کی روش۔

MashalBooks.org

بھارت

آئین پسندی کی حدود

[فلم ''رام کے نام'' جو ہندونواز قوتوں کی سربلندی پر ناقدانہ روشنی ڈالتی ہے کی سکریننگ کے بعد جیسے ہی مباحثہ شروع ہوا تو ایک عورت نے انگریزی میں بات کی، فوراً ایک چیختی ہوئی آواز آئی..... ہندی میں بات کرو..... جواب بھی فوری تھا۔ ہم تامل ہیں اور ہندی زبان نہیں سمجھتے۔ ہمیشہ سے جمہوری معاشرے میں ووٹ کرائے گئے۔ 6 غیر ہندی ہاتھ بلند ہوئے۔ اکثریت اپنے فیصلے منوالیتی ہے۔ یہی ہندی تھی۔ پھر ایک تنہا آواز اور سامنے آئی۔ میں منی پور سے تعلق رکھنے والا ناگا (ایک عیسائی) ہوں۔ میں یہاں ہندونواز بنیاد پرستی کے خلاف اظہار یکجہتی کیلئے یہاں آیا ہوں۔ اگرچہ اس نے براہ راست ہمیں متاثر نہیں کیا۔ اگر تم لوگ اکثریت، اقلیت طرز پر معاملات سے نمٹو گے تو پھر میری گنتی بالکل نہ کرو کیونکہ ہم ناگا قبائل چند ملین ہیں جبکہ بھارت ایک ارب سے زائد آبادی پر مشتمل ہے۔]

آزادی کے بعد بھارت کے مقتدر طبقے نے یکساں حقوق کے تحفظ اور زبان، مذہب، سماجی حیثیت سے اقلیتوں یا اصل باشندوں کے ساتھ غیر امتیازی سلوک کیلئے جرأتمندانہ آئین پسندی کا راستہ اپنایا۔ بھارت کا آئینی فریم ورک اقلیتوں کو ''مذہب اور زبان'' کی بنیاد پر تسلیم کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف ثقافتی حوالے سے۔ اگرچہ اقلیتوں کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ سے متعلق مسودہ آئین کو خارج از بحث قرار دے دیا گیا تاہم بھارتی آئین نے مذہب کی آزادی کو یقینی بنایا۔ اسی کے تناظر میں زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم نو کی گئی۔ قبائل اور نچلی ذاتوں کی غیر

MashalBooks.org

مساویانہ اور غیر منصفانہ تواریخ کو بدلتے ہوئے سخت اقدامات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس طرح علاقائی اور گروہی حکمرانی کی خواہشات پوری کرنے کیلئے اوپر سے نیچے تک اختیارات کی تقسیم کا سیکولر ڈھانچہ تشکیل دیا گیا۔ اس کی جڑیں ایک فریم ورک میں نہیں جو سیکولرازم اور جمہوریت کے ستونوں پر استوار تھا۔

بھارت کی جمعیت کا چیلنج بے بہا تھا: 8 بڑے مذاہب اور انکے بے شمار فرقے، 22 سرکاری زبانیں اور 325 مصدقہ مادری زبانیں۔ 4835 ذاتیں اور گوتیں۔ 60 سماجی ثقافتی ذیلی خطے اور 15 منفرد زراعتی زون۔ بھارت کی آئین ساز اسمبلی کو سیاست زدہ (مذہبی بنیاد پر) شناختوں کے نوآبادیاتی ورثے سے نمٹنا تھا۔ دوقومی نظریے کا مقابلہ کرنا تھا اور خونیں تقسیم سے دو ملکوں کے جنم کے معاملے سے نبرد آزما ہونا تھا۔

اب بھارت کو ان لاکھوں اقلیتوں کا ''مادر وطن'' بننا تھا جس میں کسی امتیاز کے بغیر مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی ہو لیکن مشترکہ شہریت کی بنیاد پر حقوق تک رسائی کے اصول کے تحت یہ پیشگوئی کی گئی کہ اس سے فرد کو فائدہ پہنچے گا اور یوں اکثریت کے سیاسی اقتدار کا باعث بنے گا۔

بھارتی آئین میں 4 بنیادی ستون ''خودمختار، سوشلسٹ، سیکولر اور جمہوری'' ہیں۔ ریاست کی سیکولر (اور سوشلسٹ) نوعیت 1976 میں ایک آئینی ترمیم کے تحت متعارف کرائی گئی جبکہ ملک ایمرجنسی کے تحت چل رہا تھا۔ سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ بنیادی حقوق سمیت آئین کی تمام دفعات میں ترمیم ہوسکتی ہے لیکن پارلیمنٹ آئین کا بنیادی ڈھانچہ تبدیل نہیں کرسکتی جس میں سیکولرازم اور جمہوریت جیسے عنصر شامل ہیں۔ سیکولرازم کا مفہوم تمام مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک کیا گیا (ایک مذہبی ریاست کو تسلیم کرنے سے انکار) جو یکساں حقوق کی بنیاد پر استوار ہو لیکن پھر اس کا ترجمہ اکثریت کی مرضی کیا گیا۔ اس سے بعض اقلیتوں نے احساس تحفظ محفوظ کیا۔ مثال کے طور پر عیسائی، جنہوں نے خود کو اقلیت کہلوانے کی بجائے سیکولر کہنا شروع کر دیا۔

بتدریج سیکولرازم وجہ تنازع بنتا چلا گیا، جس کا اکثریتی ہندو سوچ میں مفہوم ''تشفی'' اور ''جعلی سیکولرازم'' لیا گیا۔ معاشرے میں رواداری کی اقدار کے فلسفے کو فروغ دیے بغیر سیکولرازم محض ایسی انتظامی حکمت عملی تک محدود ہوئی جسے خودغرض عناصر نے اقلیتوں کو تحفظ فراہم کئے بغیر استعمال کیا۔ رنبیر سمادر نے سیکولرازم کے اصول سے مفر کے عمل کو مختصراً قلمبند کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

MashalBooks.org

''.....رواداری کے اصول کو سیکولرازم کے اصول سے نہ ملا کر آئین ریاست کو سیکولرازم کو انتظامی حکمت عملی کے استعمال سے تمام گروہوں کو خود غرضانہ انداز میں نمٹنے کا اختیار دیتا ہے، اقلیتوں کو کافی تحفظ دیے اور رواداری کے فروغ کے بغیر''۔(سماد 188:1999)

بھارتی آئین کا ابتدائیہ تمام شہریوں کیلئے انصاف اور فرد کے احترام کی بات کرتا ہے۔ آرٹیکل 14 مساوات، آرٹیکل 15 بلا امتیاز سلوک، آرٹیکل 16 سرکاری ملازمتوں میں مساویانہ مواقع۔ آرٹیکل 19 بنیادی آزادیوں اور آرٹیکل 21 زندگی اور آزادی کی بات کرتا ہے۔ آرٹیکل 25 میں سوچ، پیشنگوئی اور اپنے مذہب کی ترویج کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ آرٹیکل 26 مذہبی معاملات کے انصرام کی آزادی جبکہ آرٹیکل 28 مخصوص تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیمات کی آزادی سے متعلق ہے۔ آرٹیکل 29 زبان کے حقوق جبکہ ریاست کی طرف سے اقلیتی زبان کے تحفظ کیلئے اداروں کے قیام میں معاونت کی ضمانت دیتا ہے۔ آرٹیکل 30 اقلیتوں کے حق ''مذہب یا زبان کی بنیاد پر'' کی وضاحت کرتا ہے تا کہ وہ اپنی مرضی کے تعلیمی اور دیگر ادارے قائم کر سکیں اور ان کے معاملات چلا سکیں۔ آرٹیکل 347 بھی زبان کے حقوق کا ذکر کرتا ہے اور آرٹیکل 350 ریاست کو پابند بناتا ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کے انتظامات کرے۔ ریاست کی فلاحی نوعیت کا ذکر کیا جائے تو آرٹیکل (5)15، (4)15 تعلیمی اداروں میں جبکہ آرٹیکل (4)16 پبلک سروسز میں مخصوص نشستوں کی ضمانت دیتا ہے۔ آرٹیکل 17 اچھوتیت کا خاتمہ کرتا ہے۔

بین الاقوامی قانون دانوں نے نشاندہی کی ہے کہ بھارتی آئین نے امریکہ سمیت انتہائی جدید دساتیر سے بھی بڑھ کر مساوات کا وعدہ کیا ہے۔ اس خوبی کی فضلیت اس تاریخی عمل کا حصہ ہے جو انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد سے جڑا ہے۔ آرٹیکل 46 کے پارٹ IV کے ''رہنما اصولوں'' میں وضاحت کی گئی ہے کہ ''ریاست عوام کے کمزور طبقوں کے تعلیمی اور معاشی مفاد کو خصوصی توجہ اور احتیاط کے ساتھ فروغ دے گی''۔ یہ ہدایتی اصول بنیادی حقوق کی طرح عدالتی دائرہ کار میں نہیں آتے۔ البتہ آرٹیکل (4)15، (5) آرٹیکل (A)16، (A)4 مثبت امتیاز سے متعلق ہے۔ یعنی حکومتی ملازمتوں، تعلیمی اداروں، پارلیمنٹ کے ایوان زیریں لوک سبھا اور ایوان بالا ودھان سبھا میں شیڈولڈ کاسٹس اور قبائل کیلئے نشستیں مخصوص کرنا تاہم یہ منفی نوعیت کی ضمانت کی شکل ہیں کیونکہ یہ معاملہ انتظامیہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

MashalBooks.org

انتظامیہ کی صوابدید پر چھوڑی گئی منفی ضمانتیں

آرٹیکل (4)15: اس آرٹیکل یا آرٹیکل 29 کی کلاز (2) کے تحت ریاست کیلئے کوئی امر مانع نہیں ہوگا کہ وہ سماجی، تعلیمی طور پر پسماندہ طبقے یا شیڈول کاسٹس یا قبائلی کی ترقی کیلئے خصوصی اقدامات نہ کرے۔

آرٹیکل (5)15: اس آرٹیکل یا آرٹیکل 19 کی شق (1) کی ذیلی شق (جی) کے تحت ریاست کیلئے کوئی امر مانع نہیں ہوگا کہ وہ سماجی یا تعلیمی طور پر پسماندہ، طبقے یا شیڈول کاسٹ یا قبائلی کاسٹ کی بہتری کیلئے قانوناً خصوصی اقدامات کرے۔ ایسے طبقات کے تعلیمی اداروں بشمول نجی تعلیمی اداروں چاہے وہ ریاست کے فنڈ سے چلتے ہوں یا نہ چلتے ہوں میں داخلے کا اہتمام کیا جائیگا۔ یہ ادارے ان اقلیتی اداروں سے الگ ہوں گے جن کا ذکر آرٹیکل (30) کی شق نمبر 1 میں (آئین میں 93ویں ترمیم 2005 کے تحت) کیا گیا ہے۔

آرٹیکل 16(4): اس آرٹیکل کے تحت ریاست کیلئے کوئی امر مانع نہیں ہوگا کہ وہ ایسے پسماندہ طبقات کیلئے سرکاری ملازمتوں میں نشستوں کو مخصوص کرے گی جو ریاست کے نزدیک سرکاری ملازمتوں میں کافی نمائندگی نہیں رکھتے۔

آرٹیکل 16(4A): اس آرٹیکل کے تحت ریاست پر لازم ہوگا کہ وہ ایسے پسماندہ طبقات، شیڈول کاسٹس یا ٹرائیبل کاسٹس کی ملازمتوں میں ترقی کیلئے خصوصی اقدامات کرے گی جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ سرکاری سروس میں ان کی نمائندگی کافی نہیں ہے۔ (آئین میں 77ویں ترمیم 1995 اور 85ویں ترمیم 2001)۔

پسماندہ طبقات سے مراد ایسے افراد جن کا تعلق اس کیٹیگری سے ہے جس کی سرحدیں ڈھیلی ڈھالی ہیں اور جو شیڈول کاسٹس شیڈول ٹرائبز اور دیگر پسماندہ طبقوں پر مشتمل ہے۔ شیڈول اور قبائلی ذاتوں کا کل آبادی میں بالترتیب حصہ 8 فیصد اور 16 فیصد ہے اور ان کی کیٹیگریاں بالکل واضح ہیں۔ ''دیگر پسماندہ طبقوں'' سے مراد باقیماندہ طبقات ہیں۔ ان کی پوزیشن مبہم ہے اور 2001 کی مردم شماری میں ان سے متعلق معلومات جمع نہیں کی گئیں۔ متنازعہ مینڈل کمیشن (1980) نے ان کی تعداد کل آبادی کا 52 فیصد مقامی ہے۔ (سپریم کورٹ نے مینڈل کیس 1992

MashalBooks.org

میں قرار دیا تھا کہ ذات (کاسٹ) دراصل عمرانی لحاظ سے ایک کلاس ہے)۔مینڈل کمیشن نے ''دیگر پسماندہ طبقوں'' کیلئے 27 فیصد کوٹہ مخصوص کرنے کی سفارش کی تھی۔1990 میں وی پی سنگھ حکومت نے کمیشن کی رپورٹ منظور کر لی لیکن سرکاری ملازمتوں میں ممدود کوٹے کی اجازت دی گئی چنانچہ تعلیمی اداروں تک پسماندہ طبقات کی رسائی یقینی بننے کیلئے مزید 15 برس لگے اور پھر آئین میں 93 ویں ترمیم کے تحت آرٹیکل 5715 متعارف کرایا گیا۔اپریل 2006 میں وزیر برائے انسانی وسائل ارجن سنگھ نے اعلان کیا کہ تعلیمی اداروں بشمول اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ''دیگر پسماندہ طبقات'' کیلئے نشستیں مخصوص کی جائیں گی۔سپریم کورٹ نے عارضی طور پر فیصلے پر عملدرآمد روک دیا۔

نوٹ: آرٹیکل 15(5) مذہبی یا لسانی بنیادوں پر اقلیتوں کو آرٹیکل (1)30 کے تحت خصوصی حیثیت حاصل کرنے سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور چلائیں۔آئین نچلی ذاتوں یا قبائل کو بطور اقلیت تسلیم کرنے کی وضاحت نہیں کرتا بلکہ اس کیلئے شیڈولڈ اور قبائلی ذاتوں کیلئے الگ حصہ XVI رکھا گیا ہے۔اقلیتی حقوق کے وکیل اقبال انصاری آئین بنانے والوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں کہ انہوں نے ارادتاً مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو سماجی اور نسلی اقلیتوں سے الگ رکھا اور تقسیم کیا۔(انصاری 1996۔جلد دوم)۔جہاں تک ذات کے نظام کا تعلق ہے تو آئین اس کی مبہم منظر کشی کرتا ہے۔لیکن جیسا کہ رنبیر سمادر جو آئین پسندی کی حدود کے ناقدین نے کہا کہ ''اگرچہ آئین خود کو اس بات کا بنیادی آلہ سمجھتا ہے کہ ذات برادری کا یہ معاملہ منظم ملائیت، عدم مساوات اور عام زندگی میں نفرت انگیز سلوک کی طرف نہ چلا جائے لیکن یہ ذات برادری کی خودمختاری میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرتا جب تک اس سے حیات عامہ کو .....پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔

مثبت ضمانتیں: تحفظات اور رعائتیں

بھارتی آئین کہتا ہے کہ ''لوک سبھا اور ودھان سبھا میں شیڈول کاسٹس اور قبائلی کاسٹس کے تناسب سے ان کی نشستیں مخصوص ہوں گی''۔(آرٹیکل 330) یہ ایک لازمی مثبت ضمانت ہے۔کوٹہ سسٹم کسی مخصوص خصوصی گروپ کے ارکان کیلئے تمام ممکنہ حیثیتوں کے تناسب کا کوٹہ سسٹم مسترد کرتا ہے۔وہ لوگ جو متعین کردہ گروہوں سے تعلق نہیں رکھتے وہ عام نشستوں پر بھی الیکشن لڑ سکتے

MashalBooks.org

ہیں (مخصوص اور اوپن)۔ (آرٹیکل 334 کہتا ہے کہ 60 سال بعد مخصوص نشستیں ختم کردی جائیں)۔

آرٹیکل 335 میں کہا گیا ہے کہ انتظامیہ کی کارکردگی برقرار رکھنے کو مدنظر رکھتے ہوئے شیڈول کاسٹ اور قبائلی کاسٹ کے ملازمتوں پر دعووں کو زیرغور لایا جائے گا۔ (82ویں ترمیم 2000) اور یہ بھی کہتا ہے کہ ''کوئی امر ریاست کو اس بات سے نہیں روکے گا کہ وہ پسماندہ طبقے کے افراد کو ملازمتوں یا ترقی کیلئے رعایتی نمبر دے''۔

گاؤں اور ضلع کی سطح پر مقامی حکومت کیلئے پنچایتی راج کے ڈھانچے کو آئین میں 73ویں ترمیم کے تحت لازمی قرار دیا گیا۔ (1992) یہ خطے میں ایک نئی چیز تھی کیونکہ پہلی خواتین کیلئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔

آرٹیکل 243 ڈی (1) اے اور (بی) شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل کو ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص نشستیں فراہم کرتا ہے۔ پنچایت کے مختلف حلقوں میں بدل بدل کر نمائندگی دی جائے گی جو ایک تہائی سے کم نہیں ہوگی اور خواتین کیلئے بھی نشستیں مخصوص ہوں گی۔ ان خواتین کو براہ راست الیکشن سے منتخب کیا جائیگا کہ یا مختلف حلقوں میں روٹیشن میں نمائندگی دی جائے گی۔

بھارتی قانونی کلچر میں اقلیتیں:

بھارت کا 1950 کا آئین لفظ ''اقلیت'' کی تعریف نہیں کرتا اور صرف ''اقلیتوں'' کا ذکر کرتا ہے اور ''مذہب یا زبان'' کی بنیاد پر اقلیتوں کی بات کرتا ہے۔ اقلیتوں کے سیاسی اور معاشی حقوق کی آئینی ضمانتیں جو مسودہ آئین (49-1947) میں دی گئیں خارج کردی گئیں اور یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اکثریت اقلیتی آبادی کے ساتھ منصفانہ اور مشفق سلوک کرے گی۔

آئین کے ابتدائیے (جیسا کہ 1976 میں ترمیم کی گئی) میں ریاست کو ''سیکولر'' قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ بھارت کے تمام شہریوں کو سوچ، اظہار رائے، عقیدے، مذہب اور عبادت کی آزادی ہوگی اور ان کو مساوی حیثیت اور مواقع حاصل ہوں گے۔ بنیادی حقوق سے متعلق آئین کے حصہ سوم میں اقلیتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

1- عوام کا قانون کی نظر میں مساوی مقام کا حق اور قوانین کے تحفظ کا حق

MashalBooks.org

2- مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک کی پابندی

3- ریاست کا سماجی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طبقات کی ترقی کیلئے خصوصی اقدامات کرنے کا اختیار (شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ قبائل کے علاوہ)۔

4- ریاست کے زیرانتظام دفاتر میں شہریوں کی ملازمت کا مساوی حق اور اس ضمن میں مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر کسی قسم کے امتیاز کی پابندی۔

5- ریاست کا شہریوں کے ایسے طبقات کی سرکاری ملازمتوں کا کوٹہ مخصوص کرنے کا اختیار جنہیں کافی نمائندگی حاصل نہ ہو۔

6- عوام کا سوچ کی آزادی اور مذہب کی ترویج وتعلیم کا حق .....لیکن امن عامہ، اخلاقیات اور دیگر بنیادی حقوق سے مشروط۔

7- ریاست کا یہ اختیار کہ وہ کسی ایسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر سیکولر سرگرمیوں کو ریگولیٹ کرے یا روکے جن کا تعلق مذہبی رسوم سے ہو اور سماجی بہبود اور اصلاحات کیلئے اقدامات کرے۔

8- ریاست کا یہ اختیار کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن کے تحت ہندوؤں، سکھوں، جین مت اور بودھوں کے مذہبی ادارے کھولے جائیں۔

9- سکھ کمیونٹی کا کرپان پاس رکھنے کا اختیار۔

10- کسی طبقے کا مذہبی نامزدگی کا اختیارات امن عامہ، اخلاقیات اور صحت سے مشروط .....تاکہ مذہبی اور خیراتی مقاصد کیلئے ادارے قائم کئے اور چلائے جاسکیں۔اس کے علاوہ اپنے مذہبی امور کے انتظام کے ساتھ منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی ملکیت حاصل کرنے کا قانونی اختیار۔

11- کسی مخصوص مذہب کے فروغ کیلئے عوام کا ٹیکس (چندہ) دینے کا اختیار۔

12- عوام کی مکمل طور پر سرکاری تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم یا عبادت میں شرکت کی آزادی۔

13- شہریوں کے کسی بھی طبقے کا اپنی زبان، صحیفے اور ثقافت کو محفوظ بنانے کا حق۔

14- کسی شہری کے مذہب نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی ایک کے باعث کسی تعلیمی ادارے میں داخلے سے روکنے کی پابندی۔

MashalBooks.org

15- تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کا اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق۔

16- اقلیتوں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں کا بلا امتیاز ریاستی مالی تعاون تک رسائی کا حق۔

قانونی کثرت پسندی: ''مشترکہ شعبے'' اور ''الگ شعبے'' میں توازن:

بھارتی آئین مذہبی اقلیتوں کو ذاتی اور عوامی دونوں سطحوں پر مذہبی کثرت پسندی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اقلیتوں کے تعلیمی ادارے اور وقف املاک کا انتظام۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں کیلئے مسلم پرسنل لا (شریعت) اپیلی کیشن ایکٹ (1937) ہے۔ جو کہتا ہے کہ

''مسلمانوں کے تمام معاملات مثلاً زرعی اراضی، جائیداد کی وراثت، خواتین کی خصوصی جائیداد بشمول وراثتی جائیداد تحفے یا پرسنل لا کے تحت ملنے والی املاک، شادی، شادی کا انقطاع طلاق، علا، ظہار، لیعن، خلع اور مبارات، نان نفقہ، جہیز، گارڈین شپ، تحائف، وقف املاک اور وقف (خیراتی اور قابل خیرات اداروں کے علاوہ اور مذہبی املاک) کے متعلق فیصلے مسلمان فریق ہونے کی صورت میں مسلمان ہی کریں گے''۔

بھارتی آئین کا آرٹیکل 44 میں ریاست پر زور دیتا ہے کہ وہ یونیفارم سول کوڈ (یو سی سی) قائم کرنے کیلئے اقدامات کرے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسے رہنمائے اصول کے غیر منصفانہ حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ اکثریت، اقلیت سیاست کے سیاسی تحرک میں یو سی سی برتر ہندو قانون بالخصوص اونچی ذات کے ہندوؤں کیلئے ہجو ملیح بن گیا ہے۔ ''مشترکہ شعبے'' جو مساوات یقینی بناتا ہے اور ''الگ شعبے'' جو تنوع اور گروہی شناخت کیلئے تیار کیا گیا تھا کہ درمیان بلا تصفیہ کشیدگی نے مسلمانوں کی اکثریت کی تشفی اقلیتوں کو تحفظ دیے بغیر یقینی بنانے کے الزامات کو جنم دیا ہے۔ آرٹیکل 14، 19 اور 21 کا مشترکہ شعبہ بس اوقات اقلیتی تحفظ اور اقلیتی حقوق کے شعبے کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے جواب میں پرسنل لا کے قوانین کا ''الگ شعبہ'' بالخصوص کمیونٹی کے اندر محروم گروہوں کیلئے استحصالی ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خواتین اور دلتوں وغیرہ کیلئے۔

شناخت کی سیاست کے امور میں سپیشلائزیشن کرنے والے بھارتی پروفیسر گرپریت مہاجن سمجھتے ہیں کہ بھارتی عدلیہ اکثریت کے مذہبی اداروں کے احتساب میں اقلیت کے مذہبی اداروں کی بہ نسبت زیادہ متحرک رہی ہے۔ (مہاجن 1998)

MashalBooks.org

اس بات کا ثبوت ریاست کی طرف سے کئی ہندو مندروں اور اداروں کا انتظامی کنٹرول سنبھالنا ہے۔ مہاجن دلائل دیتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ریاست کی یہ مداخلت اکثریت کی طرف سے اس لئے قبول کی جاتی ہے کہ وہ ریاست کو اپنے مذہبی مفادات کا محافظ سمجھتی ہے۔ اس کے مضمرات پر جائیں تو اکثریت اس اقدام کو تسلیم نہیں کرتی، مہاجن اس بات پر معترض ہیں کہ کئی اقلیتی مذہبی اداروں میں بدانتظامی کا ریکارڈ سامنے آنے پر بھی عدلیہ مداخلت کرنے سے گریزاں نظر آتی ہے یوں تشفی کرنے کے نظریے کا اطلاق کیا گیا ہے۔

جن معاملات میں سپریم کورٹ نے مداخلت کی وہ عائلی قوانین کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر مطلقہ یا علیٰحدہ رہنے والی خواتین کے بارے میں تاریخی شاہ بانو کیس ہے۔ جس میں اعلیٰ عدلیہ کے اکثریتی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے ارکان کے اقلیتی کمیونٹی کے ساتھ متعصّبانہ رویے کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ محصور اقلیتی کمیونٹی کے قدامت پسند رویے میں ابال آیا۔ اس کے نتیجہ مسلم ویمن رائٹس ایکٹ (1986) کی منظوری کی صورت میں نکلا۔ یہ اقدام کانگریس حکومت نے اٹھایا جس کی نظر میں مسلمانوں کے ووٹ بنک پر تھیں۔ شناخت کی یہ جنگیں جو خواتین کے کندھوں پر لڑی گئیں وہ ریاست کی ملائیت والی نوعیت اور سرکاری نجی تعلیم کے منفی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے۔ مئوخرالذکر خواتین سے متعلق معاملہ ہے۔ افراد کے حقوق بالخصوص خواتین کے حقوق جو کمیونٹی کی شناخت کی علامت کے طور پر تیار کئے گئے کا کمیونٹی کے حقوق سے تصادم ہوا ہے۔

ریاست اور گروہی روایات کا انضمام

اکثریت کا اکثریت سے تعلق بالخصوص اس وقت مسائل کا باعث بن جاتا ہے جب آپ کے پاس ایک ایسا سرکاری شعبہ ہو جس پر ایک (بڑے) گروپ کے کنٹرول کا احتمال ہو اور جو ریاستی اداروں پر ضمنی یا کلی طور پر اپنی اقدار مسلط کرنے کے درپے ہو اور یوں سرکاری اور گروہی مفادات کو یکساں کرنا چاہے۔ اس کا ڈرامائی مظاہرہ یک نسلی ''ہندوتا'' رویے کی برتری میں اضافے کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ ہندو دائیں بازو اور اس کے منطقی ردعمل کو اوپر لانے کیلئے سماجی تاریخی عوامل کا ایک مجموعہ معرض عمل میں آیا۔ منطقی ردعمل سے مراد ''سیکولر'' اشرافیہ جس نے قبل ازیں سرکاری شعبے کی تشریح کی تھی کا دفاعی ردعمل ہے۔ ہمارا جس معاملے سے تعلق ہے وہ

ریاست اور گروہی روایات کے بڑھتے ہوئے انضمام سے سامنے کرنے والے مضمرات ہیں۔اجتماعی قانون کے سرکاری شعبے اور عائلی قوانین کے ذاتی شعبے .....وراثت، شادی، متبنیٰ بنانے ..... میں تقسیم ہمیشہ سے مسام دار ثابت ہوئی ہے۔تاہم اب سیکولر حقوق پر استوار سرکاری قانون کے شعبے میں جارحانہ کمیونٹی (ملائی) مداخلت نظر آتی ہے۔اس کا ثبوت 1987 میں دیورالاستی کیس (جو راجپوت شناخت تھوپنے کا معاملہ بن گیا) اور بھنوری دیوی (جو ایک ساتھن تھی، اس کمیونٹی کو راجستھان ریاست بھرتی کرتی ہے) کے انتہائی جارحانہ اور مدافعانہ عمرانی مباحثے میں ملتا ہے۔اس خاتون کو اس بات کی ''سزا'' دی گئی کیونکہ وہ ریاست میں بچوں کی شادی کی روایت پر پابندی کی وکالت کرتی تھی۔عدالت نے ملزموں کو اس بنیاد پر بری کر دیا کہ اونچی ذات کے ملزم ایسا قبیح فعل نہیں کر سکتے۔

ریاست اور اکثریتی کمیونٹی کے انضمام کا انتہائی ڈرامائی مظاہرہ گجرات میں مسلم کش فسادات میں بھی نظر آیا کیونکہ ریاستی اداروں نے نہ صرف خاموشی اختیار کی بلکہ قتل عام کی خفیہ طور پر حوصلہ افزائی بھی کی۔اس کا نتیجہ احمد آباد میں واضح نسلی تقسیم کی صورت میں نکلا جہاں دریائے سابرمتی نے شہر کو دو حصوں میں منقسم کرتے ہوئے اجتماعی شہریت کا منہ چڑایا۔ روینہ روبنسن (2005) نے فساد در فساد میں زندہ بچنے والوں کے تاثرات، ان کی شناخت، مقام اور وقت سے متعلق خیالات کی ترتیب نو پر تفصیلی بحث کی ہے۔ممبئی میں فرقہ وارانہ تشدد (93-1992) کے بعد مسلمان وسطی ممبئی کے مخصوص علاقوں، مغربی مضافات کے علاقے جوگیشوری اور دیگر مقامات پر جمع ہو گئے۔احمد آباد میں قدیم فصیلی شہر جوہاپور کے علاقے مسلمانوں کیلئے واحد جائے عافیت تھی۔یہاں پولیس انتہائی متحرک ہے۔''تلاشی آپریشن'' اور غیر قانونی گرفتاریاں یہاں روزمرہ کا معمول ہے۔

لسانی حقوق:۔

ہندی بھارتی یونین کی سرکاری جبکہ انگریزی معاون زبان ہے۔بھارتی یونین کی ریاستیں لسانی بنیادوں پر قائم ہیں۔اگرچہ عوامل (معاشی، سیاسی اور سماجی) کو بھی مدنظر رکھا گیا۔ریاستیں وفاق کی طرف سے منظور کردہ 22 زبانوں میں سے کوئی ایک بطور سرکاری زبان اپنانے میں آزاد ہیں تاہم یہ واضح نہیں کہ اس اقدام سے کوئی مقصد کیلئے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

MashalBooks.org

آفیشل لینگوئج ایکٹ (1963) میں ہندی کو 1965 سے واحد قومی زبان قرار دیا گیا جبکہ انگریزی بدستور اس کی معاون سرکاری زبان رہے گی۔ اس سے یہ ابہام پیدا ہوا کہ کیا ہندی زبان غیر ہندی زبان بولنے والی ریاستوں پر مسلط کی جائے گی۔ اس فیصلے سے تامل ناڈو میں 65-1964 میں بڑے پیمانے پر فسادات اور خودسوزی کے واقعات رونما ہوئے۔ مرکز میں کانگریس کی حکومت نے متاثرہ ریاستوں کو یقین دلایا کہ ہندی کو واحد زبان کے طور پر مرکز اور صوبوں میں رابطے کے طور پر مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ 22 شیڈولڈ زبانوں کو امتحان یا سرکاری ملازمتوں میں داخلے کے ٹیسٹ کے طور پر بھی اپنایا جا سکے گا۔

آئین کا آرٹیکل 343 ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں سرکاری زبان قرار دیتا ہے جبکہ آرٹیکل 344 سرکاری زبانوں پر کمیشن اور پارلیمنٹ کی کمیٹیاں قائم کرنے سے متعلق ہے۔ آرٹیکل 345 آئین کی طرف سے تسلیم شدہ علاقائی زبانوں کو استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ریاستی اسمبلی قانون سازی کے ذریعے ایک یا زائد زبان کو ریاستی زبان کے طور پر اختیار کر سکتی ہے جبکہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آرٹیکل 347 ریاست کی آبادی کے کسی مخصوص حصے کی زبان کی خصوصی اجازت مرحمت کرتا ہے۔ صدر بھارت حکم جاری کر سکتا ہے کہ اس زبان کو تسلیم کیا جائے۔ (حیدرآباد) کے اردو بولنے والے اردو کو ریاست کی زبان قرار دینے کی لابنگ کر رہے ہیں)۔ آرٹیکل 348 کہتا ہے کہ سپریم کورٹ، ہائیکورٹس اور پارلیمنٹ کے ہر ایکٹ اور بل کی زبان انگریزی ہوگی۔ آرٹیکل 350 کے تحت کسی مسئلے کے حل کیلئے کسی افسر یا حاکم مجاز کو پریذینٹیشن یونین یا سٹیٹ کی کسی زبان میں دی جائے گی۔

آرٹیکل 350 اے میں درج ہے کہ ''یہ ہر ریاستی یا مقامی اتھارٹی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان کے ذریعے دینے کے اقدامات کرے اور اس ضمن میں صدر جمہوریہ کسی بھی ریاست کو فرمان جاری کر سکتا ہے''۔ آرٹیکل 350 بی لسانی اقلیتوں کیلئے ایک خصوصی افسر تعینات کرنے کا پابند بناتا ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

MashalBooks.org

عمومی ادارہ جات

قومی انسانی حقوق کمیشن:۔ ہیومن رائٹس ایکٹ (1993) کے تحت قومی انسانی حقوق کمیشن، ریاستی ہیومن رائٹس کمیشن اور انسانی حقوق کی عدالتوں کے قیام کی راہ ہموار کی گئی۔

اقلیتوں کے انسانی حقوق سے متعلق کارکن قومی انسانی حقوق کمیشن کے طریقہ کار پر مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کا موقف ہے کہ اس کمیشن کے پاس مساویانہ سلوک اور امتیاز سے پاک سلوک یقینی بنانے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ قومی انسانی حقوق کمیشن کی اقلیتوں سے متعلق معاملات سے بظاہر لاتعلقی کی وجہ کمیشن کے ارکان میں اقلیتی نمائندگی کی عدم موجودگی ہے تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسانی حقوق کمیشن کے سربراہ جسٹس جے ایس ورما نے 2002 میں گجرات میں مسلم کش فسادات کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے اس معاملے کی طرف سپریم کورٹ کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

ریاستی انسانی حقوق کمیشن:۔ یہ ریاستی کمیشن آسام، ہماچل پردیش، جموں کشمیر، کیرالا، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، منی پور، پنجاب، راجستھان، تامل ناڈو، اتر پردیش، مغربی بنگال اور چھتیس گڑھ میں قائم کئے گئے ہیں۔

قومی کمیشن برائے خواتین (1992): اس کمیشن کی مسلمان رکن کی تحریک پر یہ کمیشن مسلمان خواتین کے حقوق سے متعلق معاملات میں کافی متحرک ہے اور طلاق ثلاثہ کی روایت کی حوصلہ شکنی، ماڈل نکاح نامے کی تیاری اور مخصوص مسائل سمیت دیگر خلاف ورزیوں سے نمٹنے کی مہم چلا رہا ہے۔

مخصوص ادارہ جاتی دائرہ کار:۔

وزارت اقلیتی امور: یہ وزارت کانگریس حکومت نے 2006 میں قائم کی تھی جس کا بڑا مقصد شمالی بھارت میں اقلیتی کمیونٹی کا اعتماد بحال کرنا تھا۔ ابھی اس وزارت کی طرف سے اقلیتی انسانی حقوق کے تحفظ کیلئے متاثر کن اقدامات کرنا باقی ہیں۔

قومی کارپوریشن برائے ترقی اقلیت و مالیاتی امور (1994): گوپال سنگھ کمیٹی (1983) کی رپورٹ میں قومیائے گئے بنکوں سے اقلیتوں کو قرضوں کے حصول میں درپیش مشکلات کے انکشاف کے بعد اقلیتوں کی ترقی اور مالیاتی امور کی قومی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ اقلیتوں کے غریب ترین طبقوں کی معاشی ترقی ممکن بنائی جاسکے۔ راجندر سچر کمیٹی (2006) کی رپورٹ میں بھارتی

MashalBooks.org

مسلمانوں کی حالت زار بہتر بنانے میں کمیشن کی ناکامی کا انکشاف سامنے آنے پر یہ کمیشن اب وزارت اقلیتی امور کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔

قومی کمیشن برائے اقلیت (1992): نیشنل کمیشن فار مینارٹیز کا قیام پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام کی وجہ اقلیتوں پر حملوں کے واقعات میں اضافہ اور اقلیتوں کے خلاف پولیس کی بڑھتی کارروائیاں تھیں۔ کمیشن کے سربراہ اور ارکان کی نامزدگی صدر جمہوریہ کرتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی عدالتی اختیار نہیں ہے اور کمیشن صرف مرکز اور ریاستوں کو سفارشات دیتا ہے۔ اقبال انصاری جیسے ناقدین اس کمیشن سے غیر مطمئن ہیں اور ان کا موقف ہے کہ قومی کمیشن برائے اقلیتاں ''بے اختیار ادارہ ہے'' اور اس کے ساتھ مرکز اور ریاستوں کا رویہ بھی معاندانہ ہے۔ اس کی رپورٹوں اور سفارشات کو عرصہ دراز تک پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا گیا۔ 1996 میں کمیشن کے چیئرمین حامد انصاری نے سپیکر لوک سبھا کی توجہ مبذول کرائی کہ کمیشن کی رپورٹیں پچھلے 10 برس سے ایوان میں پیش نہیں کی گئیں۔ کمیشن کے سربراہ اور ارکان کا تقرر حکومت کرتی ہے۔ پارلیمنٹ میں ایک آئینی ترمیم بل (2004) زیر التوا ہے جس کی منظوری سے کمیشن کو آئینی حیثیت مل جائے گی۔

ریاستی کمیشن برائے امور اقلیت: یہ کمیشن آندھرا پردیش، آسام، بہار، گجرات، ہریانہ، کرناٹک، مدھیہ پردیش، راجستھان، تامل ناڈو، اتر پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال، چھتیس گڑھ اور دہلی میں قائم کئے گئے ہیں۔

اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کا قومی کمیشن:۔ پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے 2004 میں اس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کو اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنا الحاق مرضی کی یونیورسٹی سے کرلیں۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لئے این او سی کے اجرا میں درپیش مشکلات بھی یہ کمیشن حل کرتا ہے جبکہ اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے سٹیٹس سے متعلق تنازعات بھی اسی کے تحت حل کئے جاتے ہیں۔

لسانی اقلیتوں کیلئے کمشنر:۔ آئین کے آرٹیکل 350 بی کے تحت لسانی اقلیتوں کیلئے کمشنر آفس کا قیام 1957 میں عمل میں لایا گیا۔ یہ کمشنر آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو حاصل تحفظ کے نفاذ میں کردار ادا کرتا ہے اور اقلیتوں کی تشفی کیلئے سفارشات بھی پیش کرتا ہے۔ کمشنر کیلئے لازم ہے کہ وہ

سالانہ رپورٹ تیار کرے جو متعلقہ وزارتوں، محکموں اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو بھجوائی جاتی ہے۔ جو پارلیمنٹ کے تجویز کردہ اقدامات پر عملدرآمد کرتے ہیں۔ یہ کمشنر اب تک 42 سالانہ رپورٹیں تیار کر چکا ہے۔ آخری رپورٹ 2004 میں پیش کی گئی۔

قومی یکجہتی کونسل:۔ یہ کونسل فرقہ واریت، برادری ازم، مذہب پرستی اور لسانیت سے نمٹنے کیلئے قائم کی گئی۔ 50 برسوں میں اس کے صرف 14 اجلاس ہوئے جس میں 1992 کے بابری مسجد کے واقعے پر اجلاس بھی شامل ہے۔ آخری اجلاس اکتوبر 2008 میں کانگریس کی قیادت میں قومی ترقی پسند اتحاد کی حکومت کے دوران ہوا ہے۔ یہ کونسل کبھی موثر فورم ثابت نہیں ہوئی۔

شیڈول کاسٹس اور قبائلی ذاتوں کے بارے میں قومی کمیشن: آئین میں 2006 میں ایک ترمیم کے ذریعے (آرٹیکل 338 کے تحت) National Commission for scheduled Casts and National Commision for Scheduled Tribes) قائم کئے گئے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق بھارت میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کی اصطلاح بھارتی قانونی سسٹم میں ان گروپوں بشمول نان کاسٹ ٹرائبس کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔ کسی برادری کو شیڈول کاسٹ قرار دینے کا جو سرکاری پیمانہ مقرر ہے وہ سماجی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے انتہائی پسماندگی ہے جو روایتی طور پر اچھوت کے کلچر سے جنم لیتی ہے۔ آرٹیکل 17 کے تحت اچھوت کا کلچر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور اس کا ارتکاب قانوناً جرم ہے۔

وزارت قبائلی امور برائے شمال مشرقی ریجن:۔ شیڈول قبائل کی ترقی سے متعلق تمام منصوبہ بندی اور رابطے کی ذمہ داری اسی وزارت کی ہے۔

قومی کمیشن برائے شیڈول قبائل:۔ آئین میں 89 ویں ترمیم (2003) کے تحت 2004 میں شیڈولڈ قبائل کے لئے ایک الگ قومی کمیشن تشکیل دیا گیا۔ اس کی اثر پذیری ابھی تک ثابت نہیں ہو سکی۔

خصوصی سکیمیں اور قوانین:

اقلیتوں کیلئے وزیراعظم کا 15 نکاتی پروگرام (1983): آنجہانی بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے یہ نکات تیار کئے تھے جن پر 2006 میں نظر ثانی کی گئی تا کہ اقلیتوں کی تیز تر معاشی سماجی ترقی یقینی بنائی جا سکے۔ اس ضمن میں وزارت سماجی بہبود کو اقدامات کی رپورٹ دینا لازم ہے۔

MashalBooks.org

وزیراعظم من موہن سنگھ نے اس پر نظر ثانی کی جس کے تحت کابینہ نے فیصلہ کیا کہ اقلیتوں کی تعلیمی سہولیات، انہیں ملازمتوں میں مساوی حصہ دینے اور ان کی رہائشی حالت زار بہتر بنانے کیلئے سماجی بہبود فنڈ کا 15 فیصد خصوصی طور پر خرچ کیا جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تشویشناک سماجی معاشی تقسیم قبل ازیں ماضی میں ایسی سکیموں کی ناکامی کا باعث بنتی رہی ہے۔(1955)

شہری حقوق کے تحفظ کا ایکٹ شیڈول کاسٹس اور قبائلی برادریوں کے خلاف دست درازیوں کے تدارک کا ایکٹ (1989): ان قوانین میں ان دونوں طبقوں کے ارکان پر کسی حملے کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ البتہ یہ ایکٹ زیادتی روکنے میں کم ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ ان قوانین کے تحت سزا دینے کی شرح بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر 1998 میں اس قانون کے تحت سزا کی شرح بالترتیب 22.6 اور 32.2 فیصد تھی۔

اختیارات کی تقسیم: معکوس وفاقیت

جنوبی ایشیا میں بھارت اختیارات کی نچلی سطح تک تقسیم کے معاملے میں کافی آگے ہے۔ یہ دراصل ایک معکوس وفاقی طرز حکمرانی ہے جس میں خصوصی خودمختاریوں کا جامع ڈھانچہ موجود ہے۔ اختیار کی اس معکوس تقسیم کے تجربے کو ماہر امور سیاسیات بلویر اروڑہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ''ایک مستحکم یونین کے قیام کیلئے ضروری کم سے کم سطح کی یکسانیت کی وسیع تر دریافت''۔ اس قسم کا وفاقی فریم ورک خودمختاری کیلئے جاری تنازعات (مثلاً سری لنکا) میں جمہوری خواہشات کی تعمیل کیلئے نمونہ ہے۔ سری لنکا کی جمہوریہ وفاقی نوعیت کی حکومت ہے اور آج اسے تقسیم کا سامنا ہے یا پھر فوج کے ذریعے زبردستی ہم آہنگی مسلط کی گئی ہے۔ البتہ بھارت کے وفاقی اختیارات کی تقسیم کے تجربے کا تحرک کثیر المذہب، کثیر الثقافت اور کثیر لسانی معاشرے میں اتحاد اور ہم آہنگی کی تشویش کے تناظر میں سمجھوتے کا شکار نظر آتا ہے۔

یہ وہی تشویش ہے جس نے آئین ساز اسمبلی کو اس وقت گھیرے میں لیا تھا جب وہ حکومت اور حکمرانی کی بنیادیں رکھ رہی تھی۔ آئین ساز اسمبلی کی بحثوں نے خود حکمرانی اور مشترکہ حکومت کے وسیع النظر ڈھانچے کے تصور کو جنم دیا لیکن تقسیم ہند کے سائے نے آن کر اس کی وفاقی روح کو

تحلیل کر دیا۔ انتشار اور تقسیم کی سوچ کے تاریخی تجربے نے ڈاکٹر امبیدکر کو یہ ثابت واضح طور پر کہنے پر مجبور کر دیا کہ:

''اگرچہ بھارت ایک فیڈریشن تھی لیکن یہ فیڈریشن مختلف ریاستوں کی طرف سے فیڈریشن میں شمولیت کے معاہدے کا نتیجہ نہیں تھی اور نہ اب کسی معاہدے کا نتیجہ ہے۔ کسی ریاست کو اس سے الگ ہونے کا حق حاصل نہیں۔ اگرچہ ملک اور عوام انتظامی سہولت کیلئے دو مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں لیکن یہ ملک بحیثیت مجموعی ہم آہنگ ہے۔ اس کے عوام ایک ہیں اور وہ ایک ہی وسیلے سے نکلنے والی حاکمیت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں''۔

مابعد تقسیم وفاقیت کو انتشار اور تقسیم کا حامل سمجھا گیا جہاں حکمران اشرافیہ ریاستوں کی لسانی تنظیموں کے خلاف مزاحمت کر رہی تھی اور مرکزی کنٹرول نافذ کرنے کے درپے تھی۔ پرتشدد لسانی تحریکوں نے ہی وزیراعظم جواہر لال نہرو کو ریاستوں کی لسانی تنظیم نو پر غور پر مجبور کر دیا۔ البتہ تین حاوی، مرکزیت پر مبنی اور مطلق العنان تحریکیں اختیارات میں شراکت اور ملک کی خصوصی خودمختاریوں کی حقیقت پر بار بار حملوں کے نتیجے میں سامنے آئیں۔ اول بڑھتی ہوئی قومی سکیورٹی سٹیٹ کی تشخیص، دوم ترقی کی مرکز پسند منصوبہ بندی کا ویژن جس نے پلاننگ کمیشن کو مقام فخر دیا حالانکہ یہ ماورائے آئین ادارہ تھا۔ سوم آزادی کے 40 سال بعد تک ایک سیاسی پارٹی کانگریس کی اجارہ داری۔ ان عوامل کے باعث مرکز پسندی اور ''خصوصی خودمختاریوں'' کے خلاف منفی سوچ مستحکم ہوئی۔ حتیٰ کہ مرکز۔ ریاست تعلقات کا ڈھانچہ بھی وفاقی طرز حکمرانی کے ادراک میں عدم اطمینانی کی عکاسی کرتا ہے۔

علاوہ ازیں آئین میں ایک متحدہ قسم کی طرفداری پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر 3 فہرستوں میں قانون سازی کا اختیار تقسیم کرنے کے بعد نہ صرف باقیماندہ موضوعات یونین کے پاس رہے بلکہ وفاق کنکرنٹ لسٹ میں شامل موضوعات پر بھی حاوی رہا۔ اس کے ساتھ بھارتی پارلیمنٹ نے ریاستی سرحدوں میں تبدیلی کا اختیار بھی اپنے پاس رکھا۔ آرٹیکل 1 کہتا ہے کہ ''انڈیا جو اب بھارت ہے ریاستوں کا اتحاد ہوگا'' اور آرٹیکل 3 پارلیمنٹ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ''قانون سازی کے ذریعے کسی ریاست سے علاقہ الگ کر کے یا دو ریاستوں کو ملا کر نئی ریاست قائم کر سکتی ہے''۔

یہ صورتحال امریکہ کے وفاقی ڈھانچے کے متضاد ہے جہاں وفاقی اکائیوں کی علاقائی

سالمیت کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور اختیارات کی تقسیم کی بجائے ہر ریاست بذات خود با اختیار ہے۔ بھارتی پارلیمنٹ نے نئی ریاستوں کی تشکیل کیلئے آرٹیکل 3 کو استعمال کیا اور اس استعمال کے خلاف دباؤ بھی مسلسل جاری ہے۔

ریاستوں کی لسانی تشکیل نو:

مختلف ریاستوں کی سرحدوں میں لسانی بنیادوں پر تشکیل نو کے مطالبے کے جواب میں آئین ساز اسمبلی نے 1948 میں ڈار کمیشن تشکیل دیا جس نے لسانی ریاستوں کے قیام کی اس لئے مخالفت کی کیونکہ اس سے ملک کی یکجہتی کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا تاہم مسلسل جاری لسانی تحریکوں نے وزیر اعظم نہرو کو ''ریاستی تشکیل نو کمیشن'' (1953) بنانے پر مجبور کر دیا جس نے زبانوں کی بنیاد پر ریاستوں کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔ اس معاملے میں مدراس کے تیلگو بولنے والے باشندے سبقت لے گئے چنانچہ 1953 میں ریاست آندھرا پردیش قائم ہوگئی۔ پانچ عشروں کے بعد یونین آف انڈیا آج 28 ریاستوں اور UTs پر مشتمل ہے۔

لسانی ریاستوں کی تشکیل کے ساتھ ہی علاقائی زبانوں اور ثقافت کی زبردست شورش نے سر اٹھایا۔ لسانی معیارات نے علاقائی اور نسلی اختلافات کو ہوا دی کیونکہ زبان ایک ثقافتی علامت بن گئی۔ ریاست کی لسانی، ثقافتی برتری کے تحرک نے غیر علاقائی زبان بولنے والوں کو احساس محرومی میں مبتلا کر دیا۔ حیدر آباد جیسے کثیر لسانی شہر میں ریاستی حکومت کے تیلگو زبان اور کلچر کو فروغ دینے کے جذبے نے نہ صرف اردو بولنے والوں کو مایوس کیا بلکہ فرقہ وارانہ (مسلم مخالف) سوچ کو بھی بڑھایا۔ اتر پردیش اور بہار میں مسلمان مطالبہ کر رہے ہیں کہ اردو زبان کو ان کی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ آسام میں سرکاری زبان بل (1960) نے ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کو ختم کر کے قرار دیا کہ اب آسامی ریاست کی سرکاری زبان ہوگی۔ نتیجتاً بوڈو قبائل نے خود مختار بوڈو علاقائی کونسل کا مطالبہ کیا جس میں دیوناگری رسم الخط میں بوڈو سرکاری زبان ہو۔

وفاقی طرز حکمرانی کی فعالیت کے چیلنج

مسابقتی علاقائی قوم پرستی کے تصور کا مقابلہ:

علاقائی۔ ریاستی ڈھانچوں اور احساس برتری کی حامل علاقائی شناختوں کے ارتکاز نے

اقلیتوں کو محرومی کا شکار کر دیا ہے اور ذیلی علاقائی گروپوں کی طرف سے الگ ریاستوں کے قیام کا مطالبہ مسلسل سامنے آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اندرونی بین الریاست سرحدوں کی تشکیل نو سے ناگا قبائل جیسے لوگ تقسیم ہو گئے ہیں۔ گزشتہ 50 برسوں سے ناگا قبائل خودمختاری کیلئے بھارتی ریاست کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔ 1997 کی جنگ بندی اور امن کا عمل ناگا قبائلیوں کے دوبارہ اکٹھا کرنے کے مطالبے پر اختلافات سے مشکل کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے ناگا پہاڑیوں کو منی پور ریاست سے الگ کرنا۔ منی پور کی میتائی اکثریت نے اس کی شدید مخالفت کی۔ انہیں خدشہ تھا کہ اس کا آبائی وطن یعنی وادی تنہا رہ جائے گا اور ناگا قبائل کے رحم و کرم پر ہوگا۔ بھارت کی مرکزی حکومت میتائی اکثریت والی منی پور کے طرز حکمرانی کی تحریک نواز سیاست میں پھنس کر رہ گئی ہے اور تمام ناگا باشندوں کے ساتھ سیز فائر میں توسیع نہیں کی جا سکی۔ اس ایشو کی تہہ میں وفاقی المیہ ہے۔ یعنی منی پور ریاست کے مفادات اور علیحدگی کیلئے کوشاں ناگا قبائل کے حقوق۔

مرکز کی وفاقی ابہام کے حل کیلئے ثالثی کی صلاحیت اختیارات کی تقسیم پر رہنمائی حقیقت پسندانہ وضاحت کی عدم موجودگی میں سمجھوتے کا شکار نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر 2000 میں 3 نئی ریاستوں کی تشکیل کی کیا وجہ تھی؟ چھتیس گڑھ میں زبان ثقافتی عنصر تھا۔ جھاڑکھنڈ میں قبائلی شناخت جبکہ اترانچل پردیش میں علاقائی کلچر اس کی وجہ تھی۔ یہ فرض کرنا کہ بھارت کی علاقائی شناخت بشمول خودمختاری سے متعلق وفاقی مصالحت کا پہلو جمہوری ہے تو آپ کو ثابت کرنا پڑے گا کہ نئی ریاست یا ذیلی ریاست کے قیام سے متعلق سیاسی مطالبے کو بڑے پیمانے پر عوامی حمایت حاصل ہے۔ اس کی توجیہ نظر آتی ہے کہ جھاڑکھنڈ میں خودمختاری کیلئے آدی واسیوں کی جدوجہد کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن اس ریاست کے منطقی قیام میں عوام کی خواہشات کا کم ہاتھ تھا جبکہ مرکز اور ریاست میں اتحادی حکومتوں پر برتری کیلئے سیاسی جماعتوں کا استہزائیہ زیادہ تھا۔ جہاں تک اترانچل پردیش اور چھتیس گڑھ ریاست کے قیام کا تعلق ہے تو وہاں کوئی بڑے پیمانے پر عوامی تحریک نظر نہیں آتی۔ بعض کیسوں میں جیسا کہ 1960 میں ریاست ناگالینڈ کا قیام ہے میں عوامی تحریک کا جواب کم دکھائی دیتا ہے جبکہ ناگا عسکریت پسندوں کے ایک دھڑے کو رشوت پیش کرنے کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

جہاں تک ذیلی ریاستی خودمختاریوں کا تعلق ہے خودمختار ضلع کونسلوں کا پھیلتا ہوا مطالبہ اقلیت

پسندی کی تلخ منطق کی آئینہ دار ہے۔شمال مشرق کی سیاست بھی ایک گونہ تلخ چکر میں پھنسی ہے جہاں تقسیم نو کے دعوٰی جات تسلیم کئے جانے سے منسلک ہیں اور مسابقتی اور منقسم کرنے والی شناختی سیاست کو دوام بخشتے ہیں۔

مرکز کی برتری کی روایات:۔آزادی کے بعد پہلے چند عشروں کے تاریخی تجربے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ مرکز نے ریاستوں کو آئین کے تحت حامل خودمختاری کو بزور دبانے کی کوشش کی۔آئین ساز اسمبلی پر زور دیا گیا کہ وہ جمہوری آزادیوں کی قربانی دے کر آرٹیکل 356 شامل کرے جس کے تحت قومی یکجہتی اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کیلئے انتہائی ناگزیر صورتحال میں ایمرجنسی لگانے کی اجازت دی گئی ہے تاہم مرکز نے 100 سے زائد دفعہ اس آرٹیکل کا نفاذ کیا اور سب سے پہلے 1957 میں ریاست کیرالہ میں کمیونسٹ حکومت کو ہٹا کر جمہوری قہر کا اظہار کیا گیا۔آخر کار ایس آر بومائی بنام یونین آف انڈیا کیس (1994) میں سپریم کورٹ نے ان حدود کا تعین کیا جن کے تحت آرٹیکل 356 کا نفاذ کیا جاسکتا ہے اور آئین کے تحت ریاستوں کو حاصل خودمختاریوں کے خلاف اس آرٹیکل کے غلط استعمال کا راستہ بند کر دیا گیا۔

مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کی فعالیت کا مشاہدہ کرنے کیلئے گاہے بگاہے قائم کئے گئے کمیشنوں نے بارہا وسیع تر ریاستی خودمختاری کی سفارشات پیش کیں۔ ناگا قبائل کی خودمختاری کیلئے جدوجہد، جموں کشمیر کیلئے آئین کے تحت فراہم کردہ خصوصی خودمختاری کے درجے کا خاتمہ اور پنجاب میں ہونے والی شورش بھارتی حکمران اشرافیہ کی طرف سے اختیارات میں شراکت اور خودمختاری کے لئے عوامی خواہشات کا احترام کرنے میں ناکامی کی ڈرامائی مثالیں ہیں۔ البتہ 1980 کے اواخر اور 1990 کے عشرے میں ہم نے سیاسی قوتوں کا جمہوری طرز عمل ملاحظہ کیا جنہوں نے بھارت میں اختیارات کے ڈھانچے کو آگے منتقل کیا اور حقیقی وفاقی طرز حکومت کی حوصلہ افزائی کی۔کانگریسی نظام کی اجارہ داری کے خاتمے اور کئی علاقوں میں نئی طاقتور سماجی سیاسی قوتوں کے ابھرنے سے سیاسی جماعتوں کے نظام کو علاقائیت میں تبدیل کیا اور قبل ازیں ''پسماندہ طبقات'' کی جمہوری عمل میں شمولیت یقینی ہوئی۔مرکز میں اتحادی حکومتوں کے مظہر جس میں علاقائی پارٹیوں کی حمایت پر انحصار کرنا پڑا سے مرکز۔ریاست تعلقات میں توازن پیدا ہوا۔

MashalBooks.org

اس کے علاوہ معاشی آزادیوں کی پالیسیوں نے ریاستوں کو زیادہ خودمختاری کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ غالب اتفاق رائے کہ مرکز پسند ڈھانچہ ڈلیور کرنے یا خدمات کی فراہمی میں کامیاب نہیں رہا کی عکاسی اختیارات اور وسائل کی ڈی سنٹرلائزیشن کے مطالبے سے ہوتا ہے۔ یہ مطالبہ صرف ریاستی سطح تک نہیں بلکہ نچلی سطح تک اختیارات کی تقسیم کا ہے۔ یوں اس کا نتیجہ وفاقی طرز حکمرانی کی اس سے زیادہ مضبوطی کی صورت میں نکلا ہے جتنا کہ اس کی تیاری کے وقت سوچا گیا ہوگا۔

وفاقی خودمختاریاں اور اقلیتوں کا تحفظ:۔

جہاں کثیر المرکز طرز حکمرانی کو عملی جامہ پہنانے کی تحریک کا خیر مقدم کیا جائے گا وہاں ضروری نہیں کہ ریاستوں کے اندر اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے بھی مضمرات مثبت ہوں۔ انسانی حقوق کے گروپوں نے ریاستوں میں مذہبی اور سماجی اقلیتوں پر حملوں میں اضافے کی شکایات کی ہیں۔ یہ ریاست اور اکثریتی کمیونٹی کے مفادات کے انضمام کا خطرناک مظہر بھی ہے جس کا نتیجہ بنیادی آزادیوں کی خلاف ورزیوں اور اقلیتی گروہوں کی زندگی اور املاک پر حملوں کی شکل میں نکلا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال گجرات کا فرقہ وارانہ قتل عام ہے (2002)۔ جہاں وفاقی اصولوں جو ریاستوں کی خودمختاری یقینی بناتے ہیں کا وفاقی حکومت کی بنیادی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داریوں سے تصادم بے نقاب ہوا ہے۔ جب بھارتی یونین کی وفاقی اکائی کی حکومت شہریوں کے آئین کی ضمانت کے تحت حقوق کا مذاق اڑائے گی تو پھر ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کس کو کرنا چاہیئے۔ گجرات میں آئین کے آرٹیکل 14، 15، 21 اور 25 کے تحت فراہم کردہ بنیادی حقوق کی مذہبی شناخت کی بنا پر خلاف ورزی کی گئی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت میں مرکزی حکومت نے مسلمانوں کے تحفظ کیلئے کم ہی زحمت کی جنہیں حکمران پارٹی سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والے افراد نے ہلاک کیا، زیادتی یا پھر تشدد کا نشانہ بنایا۔ مرکزی حکومت محض اس بنیاد پر گجرات میں مداخلت کرنے میں ناکام رہی کہ گجرات کی ریاستی حکومت آئینی حیثیت رکھتی ہے اور صورتحال سے نمٹنے کا اسے اختیار حاصل ہے۔

چار سال بعد 2006 میں جب ایک بار پھر گجرات فرقہ واریت کے آتش فشاں کے دہانے پر پہنچا تو اس وقت مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی جس نے خود ہی مداخلت کر کے صورتحال کو بگڑنے

سے روکا۔

تاہم یہ ایڈہاک ازم ایسی صورتحال میں آئینی وضاحت یا دو جماعتی میکانزم کا متبادل نہیں جہاں وفاقی اکائی خودسری پر اتر آئے۔ علاوہ ازیں سرکاری کمیونٹی کے مفاد کو سرکاری مفاد کے مساوی کرنے پر کنٹرول کی بڑھتی ہوئی کمیونٹی کی صلاحیت بالخصوص ان ریاستوں میں زیادہ بے باک ہے جہاں ہندونواز قوتوں کی حکومت ہے۔ اس کا نتیجہ ریاستی قانون ساز اداروں میں ایسے قوانین متعارف کرانے کی صورت میں نکلا ہے جن سے بنیادی حقوق پر زد پڑتی ہے اور آئینی طور پر منظور کردہ اقلیتوں اور مذہبی آزادی کے حقوق کو نقصان پہنچتا ہے۔

سب سے زیادہ متنازعہ تبدیلی مذہب کے بل ہیں جو اڑیسہ (1967) مدھیہ پردیش (1968)، تامل ناڈو (2002) (یہاں دراوڑ مونیترا حکومت نے حال ہی میں منسوخ کر دیا)، گجرات (2003) اور راجستھان (2006) کی قانون ساز اسمبلیوں نے منظور کئے تاہم راجستھان میں گورنر نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ راجستھان کا امتناع تبدیلی مذہب بل ریاستی قانون ساز اسمبلی کی طرف سے اقلیت کے خلاف تعصب کا غماز ہے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی ساخت سے اقلیتیں مزید غیر محفوظ ہوئی ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ''کوئی بھی شخص از خود یا کسی اور فرد کے جبر کے تحت یا کسی طرح کے فریب سے مذہب تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا.....'' ریاست کا فرقہ وارانہ ایجنڈا اس ایکٹ میں ''واپسی'' (یعنی اپنے عقیدے کی طرف واپسی) کی شق سے بے نقاب ہو جاتا ہے۔

مرکزی حکومت کی ذمہ داری اور انسداد فرقہ وارانہ تشدد: ان ریاستوں اور دیگر ریاستوں میں اقلیتوں کی بدتر ہوتی صورتحال نے ان سوالات کو جنم دیا ہے۔

1- کیا بھارتی آئین کے فراہم کردہ بنیادی حقوق اقلیتوں کو کافی تحفظ مہیا کرتے ہیں۔

2- کسی مخصوص ریاست، خطے یا علاقے میں بھارتی شہریوں کے کسی طبقے کے حقوق کی منظم انداز میں خلاف ورزی پر مرکزی حکومت کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔

3- ایسی صورت میں کیا میکانزم ہونا چاہیئے جب بنیادی حقوق کی خلاف ورزی والی ریاست اور مرکز میں ایک ہی سیاسی جماعت کی حکومت ہو اور مرکزی حکومت مداخلت سے انکار کر دے؟۔

MashalBooks.org

بھارت کے فیڈرلزم کے طالبعلم بلویر اروڑہ کا خیال ہے کہ وفاق پسندی کی ناکامی کا ڈھنڈورا اپنی عدم کارروائی کے عذر کے طور پر پیٹا جارہا ہے۔ وفاقی اصول ہائے کبھی مرکز کی طرف سے اقلیتی حقوق کے تحفظ کے نکتہ نظر سے تیار نہیں کئے گئے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ بلویر اروڑہ نے یہ ثاترات ''بھارت میں فیڈرلزم اور اقلیتوں کا تحفظ'' کے موضوع پر ورکشاپ میں بیان کئے۔ آئینی ماہر اور سنئیر قانون دان اے جی نورانی نے اقلیتوں کے تحفظ کیلئے سول سوسائٹی کے اقدامات پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

مرکز سے اقلیتوں کی تشفی کیلئے انسداد فرقہ وارانہ تشدد کے جامع قانون سازی کے مطالبے پر کانگریس کی اتحادی حکومت نے فرقہ وارانہ تشدد (تدارک، کنٹرول اور متاثرین کی بحالی) ایکٹ 2004 متعارف کرایا۔ اس میں آئین کے آرٹیکل 355 جس میں وفاق کو کسی شورش یا گڑبڑ کی صورت میں کسی ریاست میں مداخلت کا حق دیا گیا ہے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ''جب مرکز یا ریاست کی علاقے کو ''فرقہ وارانہ طور پر گڑبڑ والا'' قرار دے تو وفاقی حکومت ایڈیشنل سیکرٹری یا اس سے اوپر رینک کا افسر نامزد کرے گی جو صورتحال سے نمٹنے کے اقدامات کرے گا اور جوڈیشل زون بنائے گا''۔ نئے قانون کے تحت فرقہ واریت میں ملوث شخص کی سزا بڑھا کر دگنی کر دی گئی ہے۔ (مدت اور عمر قید کے سوا)۔ قانون کے تحت مرکز، ریاست اور اضلاع کی سطح پر فرقہ وارانہ واقعات سے متاثرہ افراد کی بحالی کی کونسلیں بنانے کا بھی مینڈیٹ دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بل مرکز اور ریاست میں اختلافات کم کرنے اور امن وامان کی ذمہ داری یقینی بنانے سے متعلق ہے تاہم اسے حمایت سے زیادہ تنقید کا سامنا ہے۔

کانگریس حکومت وزارت اقلیتی امور جیسے نئے ادارے قائم کرنے میں زیادہ کامیاب رہی ہے اور وزیراعظم من موہن سنگھ نے اقلیتوں کی بہبود کیلئے 15 نکاتی پروگرام میں نئی روح پھونکی ہے۔ البتہ یہ بدشگونی والا رجحان ہوتا ہے جبکہ اقلیتی حقوق کے تحفظ والا ادارہ تقسیم کی سیاست کا حصہ بن جاتا ہے۔ خلاف توقع اس نے سیکولرازم سے بڑھتی ہوئی بیزاری کو مزید گہرا کیا ہے کیونکہ اس طرح اسے محض انتظامی حکمت عملی تک محدود کر دیا گیا ہے۔

MashalBooks.org

خودمختاریوں کا تجربہ

آئینی دفعات (اوراس کے نتیجے میں ترامیم) سے خصوصی خودمختاریوں کا جامع ڈھانچہ تیار ہوا جو مخصوص علاقوں اور گروہوں کی خودحکمرانی اور مختلف قانونی اور انتظامی ڈھانچے فراہم کرتا ہے۔مقصد مخصوص تاریخی حالات میں روایتی قبائلی طرز زندگی کا تحفظ اوران کی سماجی معاشی ترقی یقینی بناتا ہے۔

آئین کے پانچویں اور چھٹے شیڈول (آرٹیکل 244) میں شیڈولڈ علاقوں اور قبائل کے انتظامی امور اور کنٹرول کا ذکر ہے۔شیڈول 5 وسطی بھارت میں وسیع علاقوں میں پھیلے آدی واسیوں سے متعلق ہے۔شیڈول 6 شمال مشرقی ریاستوں آسام،میگھالہ،تری پورہ اور میزورام کے قبائلی پہاڑی علاقوں کی ایڈمنسٹریشن کے بارے میں ہے۔

پانچویں شیڈول کے تحت ان ریاستوں کے گورنروں کو خصوصی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ یا اسمبلی سے منظور شدہ کسی بھی ایسے قانون کو مسترد کردیں یا اس میں ترمیم کرلیں جس سے آدی واسیوں کے مفادات پر زد پڑتی ہو۔اس ترمیم کے تحت ہر ریاست میں قبائلی مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی اور گورنر کو شیڈولڈ علاقوں سے متعلق قوانین کے نفاذ سے قبل اس کونسل سے مشاورت کا پابند بنایا گیا ہے۔ان کونسلوں کا تین چوتھائی حصہ ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ارکان پر مشتمل ہوگا۔شیڈولڈ علاقوں والی آٹھ ریاستوں بشمول تامل ناڈو اور مغربی بنگال نے مشاورتی کونسلیں قائم کررکھی ہیں۔آئین کی طرف سے فلاح اور تحفظ کیلئے تشکیل دیے گئے ڈھانچے آدی واسیوں کے مفادات کے تحفظ میں ناکام رہے ہیں۔جن کی زمینیں چھین لی گئیں۔انکی معدنیات، جنگلات اور آبی وسائل کی لوٹ مار کی گئی جبکہ وہ محروم اور بے اختیار رہے۔ان کی ثقافت تباہ ہوگئی کیونکہ انہیں بے گھر افراد کی فوج میں شامل ہونے پر مجبور کردیا گیا۔ان ریاستوں کے گورنر مختلف قوانین روکنے یا ان میں مناسب ترمیم کرنے میں ناکام ہوگئے.....انڈین فاریسٹ ایکٹ، آئی پی سی، کریمنل پروسیجر کوڈ اور کان کنی یا زمین ایکوائر کرنے کے دیگر قوانین.....جو قبائلی مفاد کے منافی تھے۔اس کی بجائے حسب معمول تمام قوانین کا قبائلی علاقوں میں بھی نفاذ کردیا گیا۔ گورنر مختلف امور پر صدر جمہوریہ کو رپورٹیں ارسال کرنے میں ناکام رہے۔آخری بار 1992 میں

MashalBooks.org

بہار، گجرات، ہماچل پردیش، مہاراشٹر، اوڑیسہ اور راجستھان کے گورنروں نے رپورٹ ارسال کی، آندھرا پردیش کے گورنر نے1986، مدھیہ پردیش کے گورنر نے1990 میں رپورٹ جمع کرائی۔ مدھیہ پردیش میں شیڈولڈ قبائل کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

آئین کے چھٹے شیڈول (آرٹیکل245 سے275) میں شمال مشرقی ریاستوں کے قبائلی علاقوں میں انتظامی امور اور حکومت کی تفصیل ہے اور خودمختار اضلاع یا خودمختار خطوں کی تشکیل کا طریقہ کار بتایا گیا ہے۔ انگریز دور میں ان علاقوں کو ''مستثنیٰ'' یا ''ضمنی طور پر مستثنیٰ'' کا درجہ دیا گیا تھا یوں مقامی معاملات کی مینجمنٹ میں قبائلی خودمختاری دی گئی تھی۔

شیڈول6 (آرٹیکل244(2)) قرار دیتا ہے کہ ان علاقوں کو خودمختار حیثیت میں چلایا جائے گا اور ہر علاقے میں ضلع کونسل یا علاقائی کونسل قائم کی جائے گی۔ اگرچہ یہ علاقے ریاست کی ایگزیکٹو اتھارٹی کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہوں گے لیکن ضلع یا ریجنل کونسل مخصوص قانون سازی، عدالتی او رمالیاتی امور میں با اختیار ہوگی۔ شیڈول6 بہرحال کسی حد تک قبائلی آبادی کی منفرد شناخت کے تحفظ میں کامیاب رہا ہے۔

چھٹے شیڈول پر نسلی تخصص اور ذیلی قوم پرستی کو دوام بخشنے پر اکثر تنقید کی جاتی رہی ہے۔ کئی ضلع کونسل والے علاقوں میں نسلی اقلیتوں کو بذریعہ انتخاب یا بذریعہ نامزدگی شاذ و نادر ہی نمائندگی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس شیڈول نے غیر قبائلی ساکنان وادی اور قبائلی پہاڑی مکینوں کے درمیان تصادم کو جنم دیا ہے۔

آرٹیکل379 اور371: اوپر سے نیچے فیڈرل ازم کے تجربات

آئین کا پارٹXXI خصوصی خودمختاریاں فراہم کرتا ہے۔ اس کے تحت ہی ''عارضی، عبوری اور خصوصی شقیں'' شامل ہوئیں۔ (تیرھویں ترمیم1963)۔ آرٹیکل370 اور371 بھارت کی معکوس وفاق پسندی کے جرأتمندانہ تجربے کی عکاس کرتے ہیں۔ بالخصوص آرٹیکل370 جس کا ریاست جموں وکشمیر پر اطلاق ہوتا ہے تنازعے میں الجھ گیا ہے۔ جہاں بی جے پی ریاست کشمیر کیلئے خصوصی حیثیت کا خاتمہ چاہتی ہے وہاں اے جی نورانی خودمختاری سے متعلق آئینی شقوں کو منظّم انداز میں بے اثر کرنے کی کوششوں پر تنقید کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

آرٹیکل370: اس آرٹیکل کے تحت بھارتی آئین میں جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت کی ضمانت دی گئی ہے اور کشمیر کے بھارتی ریاست کے مانند وفاقی ''معاہدے'' کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مہاراجہ جموں وکشمیر نے 26 اکتوبر 1947 کے معاہدے کے تحت بھارت سے الحاق کیا۔ آرٹیکل 370 میں جموں وکشمیر کیلئے 6 خصوصی رعایات ہیں۔

1- ریاست کو بھارتی آئین سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے کشمیر کا اپنا آئین بنانے کی اجازت دی گئی۔

2- بھارتی پارلیمنٹ کا اختیار صرف 3 موضوعات تک محدود کر دیا گیا..... دفاع، امور خارجہ اور مواصلات..... بھارتی صدر مہاراجہ کشمیر کے ساتھ کئے گئے معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دائرہ کار کو دیگر موضوعات تک بھی پھیلا سکتا ہے۔

3- بھارتی آئین کی دیگر شقوں اور بھارتی یونین کے اختیارات میں توسیع سے پہلے ریاستی حکومت کی رضامندی درکار ہوگی۔

4- بھارتی پارلیمنٹ کی ''کنکرنس'' عارضی ہوگی اور ریاستی اسمبلی سے اس کی توثیق لازمی ہوگی۔

5- ریاستی حکومت کی مشاورت دینے کی اتھارٹی صرف اس وقت تک باقی رہے گی جب تک آئین ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا جاتا۔ یہ ایک عبوری اختیار ہوگا۔ جب آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہو جائیگا تو ریاستی اسمبلی مشاورت دینے کے اختیار سے محروم ہو جائے گی۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے پر صدر کے اختیارات میں توسیع خود بخود ہو جائے گی۔

6- صدر کو اس شق کے خاتمے کا اختیار حاصل ہے لیکن اس کیلئے بھی ریاست کی آئین ساز اسمبلی کی سفارش درکار ہوگی۔

آرٹیکل 370 آئین کی دیگر شقوں کی طرح منسوخ کیا جاسکتا ہے نہ اس میں ترمیم ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ آرٹیکل 368 ہے جس کا اطلاق دیگر ریاستوں تک ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ آرٹیکل 370 میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی تاہم جمہوریہ صرف ریاستی آئین ساز اسمبلی کی مشاورت سے ترمیم کا اختیار رکھتا ہے۔ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس 1951 میں طلب کیا گیا اور 1956 میں وہ ختم کر دی گئی۔

MashalBooks.org

آرٹیکل 371:

آرٹیکل 371 میں عارضی، عبوری اور خصوصی شقوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس کا اطلاق باقی بھارت پر نہیں ہوتا اور بنیادی طور پر ان علاقوں کو زیادہ بہتر انداز میں انتظامی طور پر چلانے سے متعلق ہے جنہیں آئین میں خصوصی حیثیت دی گئی ہے۔ ان آئینی شقوں میں علیٰحدہ ترقیاتی بورڈوں کی تشکیل سے انتظامی ٹربیونلز، یونیورسٹیوں، پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ریاستی اسمبلیوں کی کمیٹیوں کے قیام اور آبادی کے مختلف طبقوں کو مواقع اور سہولتوں کی یکساں فراہمی تک کے معاملات شامل ہیں۔

آرٹیکل 371 اے اور جی میں کہا گیا ہے کہ ناگالینڈ (13ویں ترمیم 1962) اور میزورام (53ویں ترمیم 1986) میں بھارتی پارلیمنٹ سماجی روایات، قانون، دیوانی اور فوجداری مقدمات کی ایڈمنسٹریشن، انتقال اراضی اور وسائل کی ملکیت سے متعلق اس وقت تک کوئی قانون سازی نہیں کرسکتی جب تک کہ ان دونوں ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیاں قرارداد کے ذریعے منظوری نہ دے دیں۔ گورنر کو امن وامان کے نفاذ کیلئے خصوصی ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں اور اندورنی خلفشار میں اس کی رائے اور جائزے کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ گورنر کسی پسماندہ علاقے کیلئے ریجنل کونسل بھی قائم کرسکتا ہے جس کو زبردست اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ناگالینڈ کے علاقے تیون سنگ میں ایسی کونسل قائم کی گئی۔

بھارتی آئین کے اس آرٹیکل کا بڑا مقصد ان شقوں میں درج معاملات کو پارلیمنٹ سمیت قانون ساز اداروں کی حدود سے باہر رکھنا ہے۔ البتہ صدر جمہوریہ اور گورنر کو بعض صورتوں میں ایگزیکٹو کنٹرول ضروری دیا گیا ہے۔

MashalBooks.org

بے دخلی کی زندہ مثالیں

بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال اور بھوٹان کے نوآبادیاتی دور کے بعد کے معاشروں میں ریاست سازی کے نظام نے اکثریت نوازی کو مضبوط کیا ہے۔ اقلیت یا کسی علاقے کا اصل باشندہ ہونے کا مطلب ہر روز امتیازی سلوک کا سامنا کرنا، معاملات سے بے دخلی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے جس نے حق خودارادیت کے لئے بغاوتوں اور ''باغی'' افراد کے خلاف جوابی کارروائیوں کو جنم دیا ہے۔ اس گلے سڑے جھوٹ کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں؟ کیا اس کی ذمہ داری نظریے اور ریاست کے قانونی، ادارہ جاتی اور انتظامی فریم ورک کے ڈیزائن پر عائد ہوتی ہے؟ یا یہ سرطان حکومتی طریقہ ہائے کار اور سماجی رویوں کے باعث پلتا ہے۔ کیا برتری سیاسی، معاشی اور ثقافتی شعبوں میں اقلیتوں کے حقوق کو محدود کرنے سے پیدا ہوتی ہے؟۔ احساس برتری کا شکار اشرافیہ نے کس طرح ''پبلک آرڈر'' اور اس کے قیام کیلئے اداروں کے استعمال سے اقلیتوں کو ان کے حق سے محروم کیا۔

اقلیتوں کے حقوق کو محدود کر کے برتری پیدا کرنا

جنوبی ایشا میں اکثریت پسندی کا چیلنج بہت بڑا ہے۔ اس کے علاوہ کئی دساتیر میں بنیادی حقوق سے متعلق کئے گئے وعدوں اور آئے روز امتیازی سلوک اور عدم مساوات کی کئی اقسام کے درمیان خلیج بھی کافی زیادہ ہے۔ خطے میں 800 سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ صرف 66 فیصد آبادی کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے تک رسائی ہے۔ (اقوام متحدہ کی رپورٹ 2004)۔ مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا سرعام استحصال کیا جاتا ہے اور ان پر بے رحمانہ انداز میں حملے

MashalBooks.org

کئے جاتے ہیں۔ سماجی اقلیتوں کو برادری کے لحاظ سے محرومی کی بنیاد پر مسلسل بے دخلی کا سامنا ہے اور فیصلہ ساز اداروں، عہدوں، زمین کی ملکیت اور تعلیم میں ان کی موجودگی نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ زیادتیوں اور بے انصافیوں کا شکار ہیں۔ خط غربت کے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کی اکثریت اصل باشندوں اور اقلیتوں کی غیر متناسب تعداد پر مشتمل ہے۔ یہ اقلیتی گروہوں کے ارکان ہی ہیں جنہیں انسداد دہشت گردی ایکٹ اور دیگر ایمرجنسی قوانین کے تحت سب سے زیادہ نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہی لوگ ہلاک ہونے والوں اور فرقہ وارانہ تشدد کے الزام میں زیادہ تعداد میں جیلوں میں بند ہیں۔

MashalBooks.org

بھارت

روزمرہ کے پرتشدد واقعات اور اقلیتی عمل دخل

بھارتی منظر نامہ 2006:

بھارت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں ایک مسلمان سربراہ مملکت (صدر) رہا۔ ایک سکھ سربراہ حکومت (وزیراعظم) منتخب ہوا۔ ایک مسیحی اور غیر ملکی بھارتی شہریت والی خاتون (سونیا گاندھی) حکمران پارٹی کانگریس کی سربراہ ہیں۔ بھارت کے سب سے بڑے صوبے اتر پردیش میں ایک دلت خاتون سربراہ رہی۔ یہ آئین میں اقلیتوں سے غیر امتیازی سلوک اور ان سے مساوات کی ضمانتوں کا ڈرامائی ثبوت ہے۔ اب زرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں۔

گجرات جون 2006:

مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں دلتوں کو دیہی روزگار سکیم سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا گیا۔ گاؤں کے سرپنچ اس روزگار سکیم کے تحت اہل مسلمانوں اور دلتوں کے نام رجسٹر نہیں کرتے تھے (میڈیا پر ہونے والے شور نے ریاستی انتظامیہ کو اپنے دفاع پر مجبور کر دیا)۔ یہ اقلیتوں سے روزمرہ پیش آنے والے امتیازی سلوک کا ثبوت تھا۔ گجرات میں ایسا زیادہ ڈرامائی انداز میں ہوا بصورت دیگر پورے ملک میں یہ ایک معمول ہے۔

راجستھان 2006:

عمانوئیل مشن سے تعلق رکھنے والے 2 مسیحی افراد کو ضمانت کے بغیر حوالات میں رکھ کر

مقدمہ چلایا گیا کیونکہ ان کے قبضے سے کتاب ''حقیقت'' برآمد ہوئی جسے ہندو بنیاد پرست طبقہ اشتعال انگیز سمجھتا ہے۔ عمانوئیل مشن اس کتاب (جو دراصل انہوں نے نہیں لکھی تھی) سے دستبردار ہو گیا اور معافی مانگی لیکن اس سے ہندوتوا کے علمبرداروں کی تسلی نہ ہوئی۔ سپریم کورٹ نے معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے دونوں مسیحیوں کے خلاف کارروائی رکوا کر انہیں رہائی دلائی۔ کچھ ہی روز بعد اس مشن کے زیر انتظام یتیم خانے (جو بعد ازاں ریاست کے محکمہ سوشل ویلفیئر نے اپنے کنٹرول میں لے لیا) پر پولیس اہلکاروں نے حملہ کر کے لڑکیوں کی بیحرمتی کی۔ اس گھناؤنے فعل میں انہیں مقامی حکام کی خاموش حمایت بھی حاصل تھی۔

نئی دہلی 2006:

ایک حکومتی وزیر کی طرف سے کسی تیاری کے بغیر ''دیگر پسماندہ ذاتوں'' کیلئے تعلیمی اداروں میں 27 فیصد نشستوں کے فیصلے کے نفاذ کی مینڈل کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کے اعلان سے حکومتی ایوانوں میں بھونچال آ گیا۔ اپنی روایات کے غلبے میں کمی کے خدشے سے مڈل کلاس میں اشتعال پھیل گیا۔ سیاست زدہ انتظامی طریقہ کار نے مخصوص نشستوں کے معاملے کو توہین آمیز انداز میں نمٹایا۔ مزاحمت کیلئے اپر کلاس کے زیر کنٹرول میڈیا کی ثالثی میں جو عوامی طریقہ استعمال کیا گیا اس نے سماجی انصاف اور مساوات کی اقدار پر عملدرآمد میں ناکامی کو بے نقاب کیا.... تاکہ سماجی اور جمہوری تناظر میں تحفظات کی نشاندہی کی جا سکے۔ میڈیا کے تحفظات کے استعارے کے بعد اپر کلاس کے بچوں نے نشستوں میں کمی کے فیصلے پر سڑکوں پر آ کر احتجاج کیا اور بھنگی ذات جیسا طریقہ استعمال کیا۔ مارچ 2006 میں سپریم کورٹ نے تعلیمی اداروں میں ''دیگر پسماندہ ذاتوں'' کے لئے 27 فیصد نشستوں کا کوٹہ مختص کرنے پر عملدرآمد روک دیا۔

دلت:

بھارتی وزارت بہبود کی رپورٹ 93-1992 کے مطابق 1991 میں شیڈول اور قبائلی کاسٹس کے خلاف جرائم سے متعلق 21 ہزار 362 مقدمات درج کئے گئے۔ اسی سال 1067 دلت عورتوں سے زیادتی ہوئی۔ 731 دلت قتل ہوئے۔ آگ لگانے کے 645 واقعات ہوئے۔ 1890 دلتوں کو شدید زخمی کیا گیا۔ دلتوں کے خلاف جارحیت کے 17029 دیگر کیس بھی درج کئے گئے۔ بالفاظ

MashalBooks.org

دیگر ہر گھنٹے 2 دلتوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ہر روز 3 دلت خواتین سے زیادتی کی گئی، 2 دلت قتل کئے گئے اور دلتوں کے 2 گھر جلائے گئے۔ دلت ہونے کا مطلب ہے جانوروں کی سی زندگی گزارنا، بے عزت اور غیر محفوظ ہونا۔ پوری آبادی کا 16 فیصد ہونے کے باوجود دلت بھارت کے برادری سسٹم سے سرمو بید خل ہیں۔ اگر چہ پچھلی 6 دہائیوں میں انہیں کما حقہ فوائد بہم پہنچائے گئے تاہم وہ پھر بھی دیہاتی، غریب اور بے زمین رہے ہیں۔ بھارت کے بیشتر حصوں میں دلتوں کو ہندو مندروں اور دیگر مذہبی مقامات میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ گاؤں کے وسط سے سائیکل گزارنے پر دلت مردوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کے سامنے دلت عورتوں کو جوتے پہننے کی اجازت نہیں۔ دلت بچوں کو اکثر سکولوں کالجوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں متعصّبانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کلاس روم میں پچھلی نشستوں پر بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان کا کھانا اور ہاسٹلوں میں رہائش بھی الگ ہوتی ہے۔

امتیازی سلوک اور بے دخلی کی یہ زندہ مثالیں آئین پسندی کی حدود کی گواہی دیتی ہیں جو ان حالات میں اقلیتی حقوق کے تنوع، ثقافتی حقوق اور خودمختاری کی ضامن ہیں جب کہیں خودمختاری، تاریخی غلطیوں کی اصلاح کے فلسفیانہ عزم کا فقدان پایا جائے۔ رنبیر سمادر اس ابہام کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''بھارت میں جاری جمہوریت کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ اکثریت پسندی نہ صرف ''انصاف سب کیلئے'' اور ''احترام آدمیت'' کے اصولوں کی نفی کرتی ہے بلکہ ان کی بنیادوں کو بھی نشانہ بناتی ہے''۔ (سمادر 2004 اے)۔

غیر مساوی شہری:۔

بھارت میں تین مذہبی اقلیتیں سکھ، مسلم اور عیسائی کمیونٹی پر مبنی تشدد اور امتیازی سلوک کا ہدف رہی ہیں۔ بالخصوص ''امن عامہ'' قائم کرنے سے متعلق اداروں کے حوالے سے۔ اس کی واضح مسلمان کشمیری مسلمان ہیں جو سکھوں کی طرح اپنی ریاست میں تو اکثریت ہیں لیکن بھارتی ریاست میں ان کی حیثیت اقلیت کی سی ہے۔ منفرد سیاسی تاریخ، اس کے الحاق کے حالات، بھارتی آئین میں کشمیر کی خودمختار حیثیت کی ضمانت اور مرکزی حکومت کی بے باک مداخلت نے جموں وکشمیر کو بھارتی ریاست کے فرقہ وارانہ تعصب اور اسکی غیر جمہوری سیاست کا مرکز بنا دیا

ہے۔شورش زدہ کشمیر حقوق کے استحصال اور انصاف سے انکار کی گواہی ہے۔

سکھ:

سکھوں کے معاملے میں، اس کمیونٹی کے جغرافیائی ارتکاز نے بھارتی یونین کے اندر ڈھیلی ڈھالی خودمختاری کو قدرے ممکن بنادیا ہے۔ بلاشبہ علیٰحدہ سکھ ریاست کیلئے خالصتان تحریک کی جڑیں 1973 کی آنند پور صاحب قرارداد میں پیوست تھیں جس میں پنجابی بولنے والے تمام علاقوں کو ایک انتظامی یونٹ میں تبدیل کر کے سکھ اور سکھ مت کے مفادات کو بالخصوص تحفظ دینے کی بات کی گئی ہے۔ اپنے قیام کے فوراً بعد پنجاب کے ہمسایہ ریاست ہریانہ کیساتھ سرحدوں اور پانی کی تقسیم پر مرکز سے اختلافات نے سر اٹھایا۔ سکھ رہنماؤں نے مرکز پر پنجاب کے ساتھ امتیازی سلوک کا الزام لگایا۔ جیسے جیسے سکھوں کے مصائب میں اضافہ ہوا تو کانگریس اور اکالی دل میں کشمکش ہندو سکھ مذہبی تصادم میں تبدیل ہوگئی۔

فیصلہ کن موڑ اس وقت آیا جب بھارتی فوج نے 5 جون 1984 کو خالصتانی عسکریت پسندوں کو کچلنے کیلئے گولڈن ٹیمپل پر چڑھائی کردی۔ سکھ لیڈر سنت بھنڈرانوالہ سمیت ایک ہزار سکھ مارے گئے جن میں بڑی تعداد بے گناہ زائرین کی تھی۔ فوج کے آپریشن بلیو سٹار نے سکھوں میں بڑے پیمانے پر احساس اجنبیت پیدا کیا جن کا شکوہ تھا کہ بھارتی فوج نے ان کے مقدس ترین قیام گولڈن ٹیمپل کی بیحرمتی کی ہے۔ اس کہانی کا نکتہ عروج وزیراعظم اندرا گاندھی کے قتل کی شکل میں سامنے آیا جنہیں 31 اکتوبر 1984 کو ان کے سکھ محافظوں نے فائرنگ کا نشانہ بنایا۔ مسلسل 4 دن اور 4 راتوں تک دہلی میں تشدد کا بازار گرم رہا۔ سکھوں کو پیٹا گیا۔ اغوا کر کے ان کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ مشتعل ہندو ہجوم سکھوں کو تیل ڈال کر زندہ جلا دیتا تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کم از کم 3 ہزار سکھ قتل کئے گئے۔ 50 ہزار بے گھر ہوئے اور سکھوں کے لاکھوں گھروں اور املاک کو مسمار کر دیا گیا۔ حقائق جاننے کیلئے بھارتی انسانی حقوق گروپوں کی ٹیم نے جائزہ لینے کے بعد قرار دیا کہ ''کانگریس پارٹی کی اعلیٰ اور مقامی انتظامیہ نے سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا''۔

اس تشدد نے سکھ کمیونٹی میں ''نسل پرستی'' کو جنم دیا جو پہلے تو ہم آہنگی پر یقین رکھتے تھے لیکن

اب خالصتان تحریک کیلئے بھرتی میں لگے ہوئے تھے۔1990 کی دہائی کے اختتام تک پنجاب میں خالصتان تحریک تقریباً کچلی جا چکی تھی۔اس میں پولیس کی زیادتیوں اور خالصتان تحریک کے مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا ہاتھ تھا۔تین عشروں کے بعد گولڈن ٹیمپل اور نوتعمیر شدہ اکال تخت میں کوئی ایسی سرکاری شہادت موجود نہیں جو سکھ نفسیات کو اقلیتی نفسیات میں تبدیل کرتی ہو۔یہ معاصر سکھ ''اقلیت'' کی تاریخ ہے جس کو برتر سکھ قیادت ختم کرنے کے درپے تھی لیکن وہ ایشوز جنہوں نے پنجاب میں شورش کو جنم دیا ابھی مکمل حل نہیں ہوئے۔

مسلمان:

''اقلیتی حقوق کی بحث پر مسلمانوں نے اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے۔اس سے اقلیتوں کے بارے میں یہ وضاحت ہوسکتی ہے کہ جو انگریز دور میں اقلیتوں کے مسئلے کی سوچ سے منسلک ہے۔اسی چیز نے ''فرقہ وارانہ سیاست''،علیٰحدگی پسندی اور بالآخر تقسیم کو جنم دیا۔''اقلیتوں'' کے حوالے سے بھارتی بحث نے فرقہ واریت بمقابلہ سیکولرازم اور قوم پرستی بمقابلہ علیٰحدگی پسندگی کی ازسرنو تشریح اور حد بندی کی۔اس کی انسانی حقوق کی مرکزی دھارے کی تحریک کے منظرنامے میں بمشکل جگہ بنی۔مرکزی دھارے کی تحریک ''تمام حقوق تمام افراد کیلئے'' کے نعرے پر عملدرآمد کرنا چاہتی ہے''۔(انصاری1996)

بھارت آبادی کے لحاظ سے دنیا میں مسلمانوں کا تیسرا بڑا ملک ہے تاہم ملکی آبادی کی 13 فیصد مسلم آبادی کی حالت زار16 فیصد دلتوں سے بمشکل بہتر ہے۔ہر مسلمان کی اوسط آمدنی مجموعی اوسط آمدنی سے11 فیصد کم ہے۔نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (2000-1999) کے مطابق ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں غربت زیادہ ہے۔مسلمانوں میں شرح غربت43 فیصد ہے جبکہ بھارت کی مجموعی اوسط39 فیصد ہے۔دیہی علاقوں میں51 فیصد مسلمان بے زمین ہیں جبکہ ہندوؤں میں شرح40 فیصد ہے۔مسلمانوں میں شرح خواندگی انتہائی کم ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ حکومتی عہدوں اور کمرشل سیکٹر میں مہارتوں والی پوسٹوں پر مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔شہری علاقوں کا جائزہ لیں تو60 فیصد مسلمانوں نے سرے سے سکول کا منہ ہی نہیں دیکھا جبکہ مجموعی قومی شرح20 فیصد ہے۔صرف5 فیصد مسلمان خواتین نے ہائی سکول کی تعلیم مکمل کی اور

MashalBooks.org

صرف ایک فیصد اس سے آگے تک گئیں۔ ہر فرقہ وارانہ فساد کے بعد مسلمانوں میں غربت اور احساس محرومی میں اضافہ ہوتا ہے۔

سید نجی اللہ ''بھارتی مسلمانوں کی حالت زار'' پر ایک سٹڈی میں لکھتے ہیں (2000) کہ:

''مسلمان لیڈروں کو معاشی سماجی ترقی سے زیادہ ہمیشہ مذہبی ثقافتی ایشوز سے دلچسپی رہی''۔

انہوں نے مسلمانوں کے کردار کے حوالے سے معین شاکر کے ان الفاظ کا حوالے دیا ہے کہ:۔

''مسلمانوں کی سیاست اشرافیہ نواز رہی ہے۔ یہ لوگ مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کردار اور اردو کے درجے جیسے معاملات میں الجھے رہے۔ مذہبی ثقافتی نوعیت کے حامل یہ معاملات فرقہ وارانہ کشیدگی پر بحث سے متعلق ہیں جبکہ تعلیم، بے روزگاری، غربت اور مسلمانو ں کی منتخب ایوانوں میں کم نمائندگی ان کے ایجنڈے پر کم ہی اہمیت حاصل کرتی ہے''۔

بھارتی حکومتوں نے مسلمانوں کے علامتی اور جذباتی ایشوز پر ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ کبھی کسی متنازعہ کتاب پر پابندی عائد کر کے، کبھی پرسنل لا قوانین اور کبھی اقلیتی امور کے اداروں کے ذریعے سے تاہم 2005 میں مسلمانوں کی سماجی معاشی پسماندگی پر بڑھتی تشویش نے کانگریس حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ سماجی، معاشی اور تعلیمی شعبوں میں مسلمانوں کی حالت زار پر رپورٹ تیار کرنے کیلئے ایک قومی کمیشن قائم کرے تا کہ مناسب پالیسیاں تشکیل دی جا سکیں۔ تقریباً دو دہائیوں قبل اقلیتوں سے متعلق ڈاکٹر گوپال سنگھ کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ تمام بھارتی سروسز میں مسلمانوں کی نمائندگی کتنی کم ہے۔ آزادی کے 35 سال بعد بھی انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (آئی اے ایس) میں مسلمان صرف 128 (یعنی 3.2 فیصد)، انڈین فاریسٹ سروس (آئی ایف ایس) میں 45 مسلمان یعنی 3 فیصد تھے۔ آزادی کی 5 دہائیوں بعد جسٹس راجندر سچر کمیٹی کو یہ جانچنے کا مینڈیٹ دیا گیا ''سرکاری اور نجی ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کتنی ہے؟''۔

ڈھکی چھپی رکھے بغیر عرض ہے کہ بھارتی بیوروکریسی کی اعلیٰ صفوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی مجموعی آبادی (13 فیصد) کے مقابلے میں مایوس کن تھی۔ 1971 میں آئی اے ایس میں مسلمانوں کی نمائندگی جہاں 1.14 فیصد تھی وہ 3 دہائیوں کے بعد محض 3 فیصد تھی۔

سچر کمیٹی رپورٹ میں مسلح افواج میں مسلمانوں کی نمائندگی سے متعلق حصے پر تنازعہ پیدا ہونے کی وجہ سے اسے دبا لیا گیا کیونکہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اس سے فوج کی سیکولر حیثیت متاثر

MashalBooks.org

ہوگی۔آرمی چیف کا ردعمل یہ تھا:۔''فوج کا یہ فلسفہ نہیں ہے کہ ایسی معلومات پر امتیاز کرے۔فوج میں سب کیلئے یکساں مواقع ہیں۔ہم لوگوں کو ایسے معیارات کی طرف لے جانے کی کوشش کررہے ہیں کہ جہاں صرف میرٹ انہیں ترقی کی طرف لے جائے گا۔ہمیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ کسی فوجی کا تعلق کس علاقے سے ہے،اس کا عقیدہ اور زبان کیا ہے''۔

تاہم سرکاری شعبے کے بارے میں دستیاب اعداد وشمار سے انکشاف ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ملازمتوں بالخصوص اعلیٰ عہدوں پر نمائندگی بہت کم ہے۔بریگیڈیئر رینک کے سینکڑوں افسروں میں سے صرف 10 مسلمان تھے اور آزادی کے بعد اس عہدے پر صرف 25 مسلمان پہنچ سکے۔آزادی کے وقت مسلمان کل نفری کا 32 فیصد تھے۔2004 تک بھارت کی 13 لاکھ نفوس پر مشتمل طاقتور فوج میں صرف 29 ہزار 93 مسلمان فوجی تھی۔

سچر کمیٹی کے اخذ کردہ حقائق:

راجستھان: بی جے پی کی حکمرانی والی ریاست:

1- اقلیتوں کیلئے جس 15 نکاتی پروگرام کا زبردست ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے وہ وجود نہیں رکھتا اور کوئی مالیاتی اور عملی اہداف اس پروگرام کے نفاذ کیلئے مقرر نہیں کئے گئے۔

2- ریاستی حکومتوں کے پاس اقلیتوں کیلئے چند ہی پروگرام ہیں اور ان پروگراموں کو عملی شکل دینے کی حکمت عملی تو مضحکہ خیز حد تک کم ہے۔

3- حتیٰ کہ پرائمری تعلیم کے فروغ کیلئے شروع کئے گئے ''سروا شکشا ابھیان'' اور ''شکشا ابھیان'' پروگرام مسلمانوں کے علاقے میں داخل تک نہیں ہوسکے۔

4- نکاسی آب اور سیوریج کی سہولتوں کا مسلمان علاقوں میں گزر تک نہیں۔

5- جے پور کے مضافات میں 12 لاکھ نفوس والی مسلمان آبادی میں صرف ایک پرائمری سکول ہے جس کی عمارت بھی مناسب نہیں اور صرف چند ٹیچر تعینات ہیں۔

اس ضمن میں جب وزیر سماجی بہبود مدن دلاور سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''مسلمان ہمارے بھائی ہیں اور ہم سب مدر انڈیا کے بچے ہیں تو پھر مسلمانوں کیلئے ہر چیز الگ کرنے کا مطالبہ کیسا؟۔مسلمان بچے دیگر کمیونٹیز کے تعلیمی اداروں میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ہر

MashalBooks.org

کمیونٹی کو بنک سے قرضہ لینے کیلئے طے شدہ طریقہ کار پر عملدرآمد کرنا ہوتا ہے تو کسی مخصوص کمیونٹی کیلئے استثنیٰ کا تقاضا کیوں کیا جائے؟'' (جیکب 2006)

اتر پردیش: سماج وادی پارٹی کی حکمرانی والی ریاست جو سیکولرازم کی علمبردار ہے۔

1- یہاں مسلمانوں میں بطور اقلیت محرومی اور عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔

2- معاشی آزادی کی پالیسی کے مسلمانوں کے روایتی پیشوں یعنی بڑھئی، تالہ سازی، پاور لومز اور کانسی کے کام پر منفی اثرات پڑے۔

3- کم عمری کی شادی کی پریشان کن روایت سے مسلمانوں میں شرح اموات انتہائی بلند ہے۔

4- بابری مسجد اور ایودھیا کے ایشو کا مرکز ہونے کے باوجود اتر پردیش میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

5- وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو معاشرے کے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے میں پرعزم سیاستدان کے طور پر جانے جاتے ہیں تاہم اقلیتوں کو یوپی حکومت سے کم ہی مدد ملتی ہے جس نے سیکولرازم کا حلف اٹھا رکھا ہے۔ انسانی وسائل کے وزیر مدرسوں کے اساتذہ کو درپیش مسائل اور نصاب کو اپ گریڈ کرنے کی ضرورت سے اچھی طرح آگاہ ہیں لیکن اس کا کوئی (مسلمانوں کی طرف سے) جواب سامنے نہیں آیا۔

6- آئین میں 86 ویں ترمیم کے تحت بھارتی حکومت پرائمری تعلیم عام کرنے کے پروگرام کا مینڈیٹ رکھتی ہے۔ جس کے تحت 6 سے 14 سال عمر کے ہر بچے کیلئے لازمی تعلیم ایک بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

مسلمان اور سیاسی نمائندگی:

عالمگیر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عددی طاقت پر مشتمل جمہوری طرز حکمرانی کے تناظر میں بھارت میں اقلیتوں کی ادارہ جاتی اور سیاسی اہمیت کم ہے۔ (راجندر سچر کمیٹی 2006)

مسلمانوں میں یہ احساس عام ہے کہ ان سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے اور انہیں سرکاری شعبے سے بیدخل رکھا گیا ہے۔ اس کا بین ثبوت لوگ سبھا میں مسلمانوں کی کم نمائندگی سے ہوتا ہے۔ گزشتہ 14 عام انتخابات (1951-71) میں مسلمانوں کی نمائندگی 4 سے 5 فیصد کے درمیان

MashalBooks.org

گھومتی رہی۔ یہ سطح ایمرجنسی کے بعد کے دورانیے (1977-1980) میں اچانک بڑھ کر 9 فیصد ہوگئی لیکن اب یہ دوبارہ 5 سے 6 فیصد تک نیچے آ گئی ہے۔ 2004 کے عام انتخابات میں 243 رکنی لوک سبھا کے ایوان میں 35 مسلمان ارکان تھے۔ 1999 میں یہ تعداد 32 تھی لیکن اضافے کے باوجود مجموعی شرح 6.4 فیصد رہی جو 13 فیصد آبادی کے لحاظ سے بہت کم نمائندگی ہے۔ مسلمان رکن پارلیمنٹ سید شہاب الدین کے ٹھوس تجزیے کے مطابق (2004) پارلیمنٹ میں نمائندگی کے تناظر میں مسلمانوں میں محرومی کی سطح 50 فیصد ہے۔ 35 فیصد ارکان پارلیمنٹ میں سے 28 کا انتخاب مسلم اکثریتی حلقوں سے ہوا جبکہ 7 دیگر علاقوں سے منتخب ہوئے۔ 1999 میں صرف 4 مسلمان دیگر علاقوں سے منتخب ہو سکے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتخابی حلقوں کی نئی حلقہ بندی نے مسلمانوں کے اپنے نمائندے منتخب کرنے کی صلاحیت کو مزید متاثر کیا ہے۔ (حلقہ بندی کمیشنوں کا قیام ایکٹ آف پارلیمنٹ سے عمل میں آیا ہے، تازہ ترین ڈی لمٹیشن ایکٹ 2002 میں منظور ہوا۔ اس کے احکامات کو قانونی طاقت حاصل ہے۔ کمیشن نے لوک سبھا کی نشستیں 542 برقرار رکھیں۔ نئے کمیشن کو ووٹروں کی تعداد کے حوالے سے جغرافیائی علاقوں میں نئی حلقہ بندیوں کی ذمہ داری سونپی گئی ہے)۔

نئی حلقہ بندی کا عمل: انتخابی ڈائنامکس میں خامی:۔

چھوٹے مگر ملک کے طول و عرض میں پھیلے گروہوں کا قانون سازی میں نمائندگی کے حوالے سے احساس محرومی جائز ہے لیکن اس کا اظہار مسلمانوں جیسی بڑی اقلیت (13 فیصد) میں ہونا چاہیئے جو لوک سبھا کے 67 سیگمنٹ کے 25 فیصد پر مشتمل ہے اور انتخابی تحرک میں بنیادی خامی کی نشاندہی کرتا ہے۔ وزیراعظم کی قائم کردہ اعلیٰ اختیاراتی (راجندر سچر) کمیٹی کی رپورٹ برائے حیثیت مسلمانان (2006) میں نئی حلقہ بندیوں پر مسلمانوں کے زبردست تحفظات سامنے آتے ہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی نمائندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے ہیں کیونکہ شیڈولڈ کاسٹ کیلئے ایسے کئی حلقے مخصوص کر دیے گئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کمیٹی نے اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال 3 ریاستوں کے ڈیٹا کا جائزہ لیا اور نوٹ کیا کہ حلقہ بندی کمیشن نے ایسے کئی حلقوں کو ''ریزرو'' قرار دیے دیا جہاں مسلمانوں کی آبادی 50 فیصد سے زائد تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ایسے

MashalBooks.org

علاقے جہاں شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی 50 فیصد سے زائد تھی کو غیر مخصوص (Unreserved) قرار دے دیا گیا۔

بھارتی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں لوک سبھا میں مسلمانوں کی نمائندگی 5 سے 6 فیصد کے درمیان رہتی ہے۔ گجرات (مسلمانوں کی آبادی 9 فیصد) اور مدھیہ پردیش (مسلمانوں کی آبادی 5 فیصد) جیسی کئی ایسی ریاستوں میں بعض الیکشنوں میں ایک بھی مسلمان قانون ساز اسمبلی کیلئے منتخب نہیں ہوا۔ آسام جہاں مسلمانوں کا الیکٹوریٹ 35 فیصد ہے صرف 2 مسلمان ارکان منتخب ہو کر لوک سبھا میں جاتے ہیں۔ اس طرح مغربی بنگال کا ایک چوتھائی حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن 42 ریاستی ارکان پارلیمنٹ میں صرف 6 مسلمان ہیں۔ مہاراشٹر اور تامل ناڈو میں کوئی بھی مسلمان رکن پارلیمنٹ نہیں۔ آئین کی فعالیت کے جائزہ لینے کیلئے قائم قومی کمیشن (2002) کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ لوک سبھا کے 67 حلقوں میں مسلمانوں کی آبادی 25 فیصد یا اس سے زائد ہے۔ 12 حلقے شیڈول کاسٹس یا شیڈولڈ قبائل کیلئے مخصوص ہیں۔ ان میں سے بعض حلقوں میں اگر وہ شیڈولڈ کاسٹس کیلئے مخصوص نہ کئے جاتے تو مسلمان امیدوار کو منتخب کرنے کا امکان تھا۔ اعداد و شمار خود بولتے ہیں: کریم گنج کا آسام میں علاقہ 45 فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن یہ شیڈولڈ کاسٹ کے لئے مخصوص ہے اگرچہ وہاں شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی صرف 15 فیصد ہے۔ بجنور جہاں مسلمانوں کی آبادی 38 فیصد جبکہ شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی 32 فیصد ہے بھی مخصوص نشست والا علاقہ ہے۔ یہی صورتحال مغربی بنگال کے علاقے بیربھوم میں نظر آتی ہے جہاں 35 فیصد مسلمان اور 32 فیصد شیڈولڈ کاسٹس ہیں۔ اوٹاپالم کیرالہ میں 30 فیصد مسلمان اور 17 فیصد شیڈولڈ کاسٹس ہیں۔ بہار کے علاقے آرایا میں 28 فیصد مسلمان اور 21 فیصد شیڈولڈ کاسٹس ہیں لیکن پھر بھی وہ شیڈولڈ کاسٹس کیلئے مخصوص نشست میں شامل ہے۔ کئی دیگر حلقوں میں بھی مسلمانوں اور شیڈولڈ کاسٹس میں عددی حیثیت کا فرق ہے۔

تعلیم:

بھارتی مسلمانوں میں شرح خواندگی 59 فیصد ہے جبکہ ملک کی مجموعی شرح خواندگی 65 فیصد ہے۔ (مردم شماری 2001) جہاں شہری علاقوں میں مسلمانوں اور ''دیگر'' کے درمیان فرق کم

MashalBooks.org

ہو رہا ہے وہاں دیہی علاقوں میں یہ فرق بدستور برقرار ہے۔ مسلمانوں کے 6 سے 14 سال عمر کے 25 فیصد بچوں نے یا تو سکول کا کبھی منہ نہیں دیکھا یا وہ سکول چھوڑ گئے۔ جنس اور جائے سکونت کے موازنے (راجندر سچر کمیٹی 2006) سے انکشاف ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دورانیہ تعلیم بھی سب سے کم ہے اور دیہی صورتحال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اوسطاً ایک بچہ 7 سے 16 سال کی عمر تک صرف 4 برس تک سکول جاتا ہے جبکہ مسلمانوں میں یہ شرح 3 سال ہے۔ مسلمان لڑکوں میں فرق زیادہ ہے جبکہ لڑکیوں کی شرح نسبتاً بہتر ہے۔

اقلیتی تعلیمی ادارے:

بھارتی آئین اقلیتوں کی زبان، مذہب اور ثقافت کے تحفظ کیلئے ان کے اجتماعی حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔ آرٹیکل 29 اور 30 ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے متعلق ہیں۔ آرٹیکل 30 کے تحت اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی اجازت ہے جبکہ آرٹیکل 350 اے کہتا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم یقینی بنانے کیلئے ضروری سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ اردو میڈیم سکول میں زیر تعلیم طالبعلم کیلئے اس کا کیا مطلب ہے؟ ۔ پورے بھارت میں اردو میڈیم سکولوں نے سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن جماعت دہم کے امتحانات میں ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے (2006)۔ ان سکولوں میں کامیابی کی شرح 27 فیصد رہی۔ 2006 کے سروے جو این جی او ''فرینڈز آف ایجوکیشن'' نے کیا تھا کے مطابق اس ناقص کارکردگی کی بڑی وجہ درسی کتب کی عدم دستیابی، ریاستی حکومتوں کی طرف سے فنڈز اور وسائل کی عدم فراہمی اور اکثر اساتذہ کا غیر سنجیدہ رویہ ہے۔ آندھرا پردیش میں 9 اردو سکولوں میں شرح کامیابی صفر ہے۔ بہار میں یہ شرح 27 فیصد اور دہلی میں 20 فیصد تھی۔ اردو میڈیم سکول سرکاری سکولوں کے مقابلے میں کہیں پیچھے ہیں۔

مدارس میں حصول تعلیم مسلم شناخت کا استعارہ بن چکا ہے اور انہیں مشکوک مقامات سمجھا جاتا ہے۔ ہندو دائیاں بازو انہیں ''دہشت گردی کی نرسریاں'' قرار دیتا ہے۔ کئی مسلم خاندان جدید سکولوں میں بچوں کو بھیجنے کی بجائے مدارس میں پرانی طرز کے ذریعہ تعلیم کے حامی ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی رویے کی وجہ سے کئی نسلوں سے مسلمان تعلیم کے میدان میں پیچھے ہیں اور وہ اس تعلیم سے بمشکل روزی روٹی کمانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس متعصب دیومالا کو مسترد

MashalBooks.org

کرتے ہوئے سچر کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا کہ صرف 4 فیصد مسلمان بچے باضابطہ طور پر کل وقتی کسی مدرسے میں جاتے ہیں۔ کئی جگہوں پر مدارس تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں چنانچہ سچر کمیٹی نے سفارش کی کہ مدارس کو باقاعدہ سکولوں کا متبادل نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اعزازی ذریعے کے طور پر لینا چاہیئے۔

اس سے پہلے ریاستی سطح پر سکول نہ جانے والے بچوں کو ترغیب دینے اور فروغ تعلیم کے لئے مدرسوں کے نیٹ ورک سے جدید تعلیم کے ذریعے فائدہ اٹھانے کی مہم شروع کی گئی ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس ضمن میں ریاستی حکومتوں کو ''تجدید مدارس'' پروگرام کے تحت معاونت فراہم کی جارہی ہے تاکہ غیر روایتی مضامین ریاضی، سائنس اور انگریزی پڑھانے کیلئے اساتذہ بھرتی کئے جاسکیں۔

مسلم کمیونٹی کی طرف سے مدارس کی تنظیم نو میں دلچسپی اور صلاحیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جے پور (راجستھان) کی رحمانی مسجد سے ملحق مدرسے نے راجستھان محکمہ سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف سے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ایک مقابلے میں ریاست بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی (2006)۔ اس مدرسے نے ایک دہائی قبل جدید تعلیم کا آغاز کیا تھا اور ایک کمپیوٹر لیب قائم کی جہاں 30 کمپیوٹر تھے۔

اس سے بھی بڑھ کر مغربی بنگال ہے جہاں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت نے مدارس کو ''مینارہ برداشت'' میں تبدیل کردیا ہے۔ مغربی بنگال اور آسام میں آل انڈیا مدرسہ بورڈ نے ایک مساوی ڈھانچہ تیار کرنے پر کام شروع کررکھا ہے جو طلبا کو سکول کے تعلیمی نظام سے ہم آہنگ کرے گا۔

اقلیتی اداروں کی خودمختاری

جہاں بھارتی آئین کا آرٹیکل (2)29 یہ کہتا ہے کہ کسی بھی شہری کو کسی ریاستی ادارے یا حکومتی امداد سے چلنے والے تعلیمی ادارے میں مذہب، نسل، ذات اور زبان کی بنیاد پر داخلہ حاصل کرنے سے نہیں روکا جائے گا وہاں آرٹیکل (1)30 تمام اقلیتوں کو اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے بنانے اور چلانے کی ضمانت دیتا ہے۔ عدالتیں بار بار ان دونوں حقوق کے درمیان کھینچا تانی کا فیصلہ کرنے کا مطالبہ کرچکی ہیں۔

MashalBooks.org

سینٹ سٹیفن کالج بنام دہلی یونیورسٹی کیس (1992) میں سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اقلیتی ادارہ جو ریاست سے فنڈ وصول کر رہا ہو وہ مذہب یا زبان کی بنیاد پر اپنی ہی کمیونٹی کے بچوں کو داخلے میں ترجیح دے گا یا نشستیں مخصوص رکھے گا۔ البتہ عدالت نے اجازت دی کہ یہ ادارہ اپنی کمیونٹی کو 50 فیصد داخلے دے گا اور تفریق کے اس سلوک میں یونیورسٹی کے معیارات کو مدنظر رکھا جائیگا۔ عدالت نے کہا کہ داخلوں میں تفریق کا یہ عمل آرٹیکل (2) یا آرٹیکل 14 (قانون کی نظر میں برابری) کی خلاف ورزی نہیں اور متعلقہ اقلیت کی انفرادیت برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے۔ اقلیتوں سے متعلق امور پر سپریم کورٹ کے فیصلوں جن میں مذہبی آزادی کا معاملہ زیر بحث آیا کا تجزیہ کرتے ہوئے گرپریت مہاجن (1998) کہتے ہیں کہ:

''مذہبی آزادی برقرار رکھنے اور مذہبی معاملات میں خودمختاری کے بارے میں سپریم کورٹ کا رجحان اتنا واضح ہے کہ سپریم کورٹ نے اکثر و بیشتر سماجی طور پر قدامت پسند ہونے کا تاثر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے کسی مذہبی گروہ کے سربراہ کو منحرفین کے خلاف کارروائی کا حق دیا ہے چاہے اس سے اس کے شہری حقوق پر ہی کیوں نہ زد پڑتی ہو (سردار سیدانہ ٹی سیف الدین بنام ریاست بمبئی کیس 1962)۔ کئی مواقع پر سپریم کورٹ نے ہائیکورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دیتے ہوئے مذہبی رسومات کی ادائیگی میں آزادی کے حق کو تحفظ دیا۔ مثال کے طور پر گودہ سرسوتھ برہمنوں کی طرف سے اپنے حقداروں سے ہندو آبادی کو بیدخل کرنے کا معاملہ (دیوارو بنام ریاست میسور)''۔

امن عامہ:

فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات کے دوران مسلمان زیادہ متاثر ہوتے رہے ہیں۔ رانچی (1961) میں 184 ہلاک شدگان میں سے 164 مسلمان تھے۔ احمد آباد (1969) 512 مرنے والوں میں 413 کا تعلق اسلام سے تھا۔ بھیونڈی (1970) میں 79 افراد قتل ہوئے 59 مسلمان تھے۔ نلائی (1983) میں 1800 سے زائد مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ 1980 کے عشروں کے بعد سے ہر سال فسادات ہوتے رہے۔ بہار شریف (1981)، میروت اور برودہ (1982)، نلائی آسام (1983)، بھیونڈی بمبئے (1984)، احمد آباد (1985-86)، میروٹ (1987)، بھاگل پور

میں (1989)۔ سرکاری تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹوں میں انکشاف کیا گیا ہے کہ راشٹریہ سیوک سنگھ، سنگھ پریوار اور شیوسینا جیسی ہندو انتہا پسند تنظیموں کی کارروائیوں میں پولیس اور انتظامیہ کے افسروں کی بھی ساز باز شامل رہی۔

1990 میں بی جے پی کے لیڈر ایل کے ایڈوانی کی رتھ یاترا کے دوران فسادات کے کئی واقعات ہوئے۔ تاریخی بابری مسجد کی جگہ رام مندر تعمیر کرنے کی اس مہم میں جگہ جگہ ہندوؤں کو مشتعل کیا گیا۔ مغل بادشاہ بابر کے جانشینوں کے طور پر مسلم اقلیت کو نشانہ بنایا گیا۔ ہر مقام پر ایڈوانی کی شعلہ بیان تقریروں سے ہندو ہجوم مشتعل ہوتا اور مسلمانوں کے مکانات اور دکانوں کو نشانہ بناتا رہا۔ ان بلوائیوں کی قیادت بی جے پی کے عہدیداروں نے کی۔ اس کا انجام بابری مسجد کی کارسیوکوں (ہندو عقیدتمندوں) کے ہاتھوں دسمبر 1992 میں ''منظّم'' شہادت سے ہوا۔ اس کام کی بی جے پی کی حکومت اور قومی قیادت نے حوصلہ افزائی کی جبکہ متعصب انتظامیہ اور پولیس نے بلوائیوں کی مدد کی۔ اس کا جوابی ردعمل المناک اور خوفناک تھا۔ بمبے میں (جنوری 1993) پے در پے بم دھماکوں میں ایک ہزار سے زائد افراد مارے گئے جبکہ ٹرین میں ''حادثاتی'' آتشزدگی کے نتیجے میں (جسٹس یوسی بینرجی کمیشن کے مطابق) گودھرا ریلوے سٹیشن پر 60 افراد ہلاک ہوئے جن میں اکثریت کارسیوکوں کی تھی۔ اس واقعے کو ہندو کمیونٹی میں اشتعال انگیزی کیلئے استعمال کیا گیا۔ اسکے بعد ہونے والے فسادات میں 200 ہندو اور 3 ہزار مسلمان اپنی جانوں اور املاک سے محروم ہوئے۔ کئی باوثوق دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ پولیس کو ہدایات جاری کی گئیں کہ ''ہندوؤں کو ان کا غصہ اتارنے کا موقع دیا جائے''۔

گجرات میں 2002 ہونے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثریتی کمیونٹی نے سرکاری شعبے اور تمام ریاستی اداروں پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ قومی میڈیا اور مقامی پولیس کے کچھ حصے نے تشدد کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن جیسے مرکزی حکومت کے اداروں کو فسادات رکوانے پر مداخلت کرنے کیلئے مجبور کردیا۔ البتہ گجرات کی ہندو اکثریت نے قومی سطح پر ''نسل کشی'' قرار دیے گئے واقعے پر معذرت خواہ ہونے سے انکار کردیا اور قتل عام کے سرپرست وزیراعلیٰ نریندر مودی کو دوبارہ ریاستی سربراہ منتخب کرلیا۔

اقلیتوں کے خلاف سیاسی تشدد ہندو انتہا پسند قوتوں کی شہ سے عروج پر پہنچ گیا۔ جس سے

MashalBooks.org

بڑے اداروں مثلاً پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ میں فرقہ واریت کا عنصر بڑھا۔ گجرات میں 300 سے 400 ملزم پکڑے گئے، ان میں صرف 3 ہندو تھے۔ TADA اور POTA جیسے ڈریکولائی قوانین کو زیادہ تر اقلیتی کمیونٹی کے باغی ارکان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ غیر سرکاری تنظیم پیپلز ٹریبونل کی ایک تحقیق کے مطابق جولائی 2004 میں 10 ریاستوں کے اعداد و شمار سے انکشاف ہوا کہ POTA قانون کے تحت گرفتار کئے گئے افراد میں سے 99.9 فیصد (یعنی سو فیصد) مسلمان تھے۔ (سب رنگ کمیونیکیشن 2004)

عدلیہ کا کردار:۔

اقلیتوں کے بنیادی حقوق اور آزادی کے تحفظ کے اہم ایشو کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ اس معاملے میں عدلیہ کے کردار کے بارے میں بے یقینی بڑھ رہی ہے۔ بالخصوص حالیہ عدالتی فیصلوں سے اشارہ ملتا ہے کہ اکثریت کے ساتھ تعصب اور جانبداری کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

سامنا ''نفرت انگیز تقریر'' کیس:۔

8 دسمبر 1992 کو شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے اپنے مراٹھی زبان کے رسالے ''سامنا'' میں ایک مضمون میں لکھا کہ ''مسلمانوں کو بابری مسجد کے انہدام سے سبق سیکھنا چاہیئے ورنہ ان کا اپنا انجام بھی ویسا ہوگا۔ جو مسلمان اس انہدام پر تنقید کرتے ہیں ان کا کوئی مذہب ہے نہ قومیت''۔

اس اشتعال انگیزی پر مہاراشٹر حکومت نے دفعہ 153 (اے) تعزیرات ہند کے تحت کوئی کارروائی نہ کی تاہم شہریوں کے ایک گروپ نے بمبی ہائیکورٹ میں رٹ دائر کردی تاکہ صوبائی حکومت کو ٹھاکرے کے خلاف قانونی کارروائی کا حکم جاری کیا جاسکے۔ ہائیکورٹ نے کیس سننے میں طویل وقت لگایا اور آخر کار یہ کہہ کر رٹ خارج کردی کہ یہ معاملہ دو سال پرانا ہے اور ''پرانے معاملات'' کو دوبارہ زندہ کرنا غیر دانشمندی ہوگی۔ درخواستگزار نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی تو وہاں سے بھی وہی جواب ملا۔

MashalBooks.org

بیسٹ بیکری کیس:۔

یہ گجرات فسادات کے دوران وڈوڈرا Vadodara کے علاقے میں قائم ''بیسٹ بیکری'' میں یکم مارچ 2002 کو رونما ہونے والا واقعہ ہے جہاں 14 افراد کو قتل کر دیا گیا اور ان میں سے بیشتر کو زندہ جلا دیا گیا۔ مقدمے کے تمام 21 ملزموں کو تیز رفتار سماعت کرنے والی عدالت نے 73 گواہوں میں سے 37 کی شہادتیں قلمبند کرنے کے بعد ثبوت کی کمی کے باعث بری کر دیا۔ ان گواہوں میں ایک ظہیرہ شیخ بھی تھی جو کمرہ عدالت میں پھٹ پڑی۔ عدالتی فیصلے میں پولیس کو ایف آئی آر کے اندراج میں تاخیر، مناسب تفتیش نہ کرنے اور بے گناہ افراد کو ہراساں کرنے پر مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ مرکزی گواہ بیکری مالک کی بیوی اور بیٹی نے پولیس اور قومی انسانی حقوق کمیشن کو بتایا کہ پٹرول بموں سے مسلح 500 افراد نے بیکری پر حملہ کیا۔ انہوں نے بی جے پی اور دیگر جماعتوں کے سیاستدانوں پر الزام لگایا کہ وہ گواہوں کو منحرف ہونے کیلئے ہراساں کر رہے ہیں۔

ستمبر 2004 میں گجرات ہائیکورٹ نے مقدمے کی از سر نو سماعت کیلئے حکومتی اپیل کو سماعت کیلئے منظور کر لیا۔ اکتوبر 2004 میں سپریم کورٹ کی سرزنش پر پولیس نے گواہوں کو ڈرانے دھمکانے پر بی جے پی کے ایک لیڈر کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ دسمبر 2004 میں گجرات حکومت نے اعتراف کیا کہ اس معاملے میں پولیس کی طرف سے ایف آئی آر کے اندراج اور تفتیش میں غفلت کا مظاہرہ کیا گیا جبکہ گواہوں کے بیانات ریکارڈ کرنے کے کام میں بھی خامیاں ہیں۔ پولیس نے نام ظاہر نہ کر کے ملزموں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

نومبر 2004 میں ظہیرہ شیخ اپنے بیان سے پھر منحرف ہو گئی اور کہا کہ گجرات ہائی کورٹ نے جو فیصلہ سنایا ہے وہ درست ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ گواہوں کو ڈرانے والے بی جے پی کے کسی رکن اسمبلی سے نہیں ملی اور اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے پہلے بیانات این جی او کی کارکن ٹیسٹا ستیل واڈ کے دباؤ پر دیے تھے۔ دسمبر 2004 میں استغاثہ نے ظہیرہ شیخ کو ایک جارح گواہ قرار دے دیا، یہ اس کیس میں جارح قرار پانے والی ساتویں گواہ تھی، 24 دسمبر 2004 کو مسلمانوں نے ظہیرہ شیخ کو اس بنیاد پر کمیونٹی سے بیدخل کر دیا کیونکہ وہ مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ اس فیصلے کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی حمایت حاصل تھی۔

MashalBooks.org

24 فروری 2006 میں کیس کے دوبارہ ٹرائل کے دوران ممبئی کی عدالت نے 7 افراد کو مجرم قرار دیتے ہوئے عمر قید کی سزا سنائی جبکہ 8 دیگر ملزموں کو بری کر دیا گیا۔ عدالت نے حلف اٹھا کر جھوٹ بولنے پر ظہیرہ شیخ کیخلاف کارروائی کی۔ 29 مارچ 2006 کو ایک عدالت نے اسے جھوٹ بولنے پر اسے ایک سال کیلئے جیل بھجوانے اور جائیداد ضبط کرنے کی سزا سنائی۔

دلت:

مسلسل امتیازی سلوک، سماجی رویہ اور معاشی غلامی

بھارتی حکومت نے کسی کمیونٹی کو ''شیڈولڈ کاسٹ'' قرار دینے کا جو معیار بنایا ہے وہ سماجی، تعلیمی اور معاشی میدان میں انتہائی پسماندگی پر مبنی ہے جو اچھوت ہونے کی روایتی رسم سے ابھرتی ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ شیڈولڈ ٹرائب کی انتظامی اصطلاحات آزادی سے پہلے سے مستعمل ہیں۔ آئین کے تحت حاصل ٹھوس ضمانت کے باعث سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں نشستیں مخصوص ہونے سے ان کے ساتھ معاشی ناانصافی اور مذہبی امتیاز کا کافی حد تک ازالہ ہوا ہے۔ دلتوں (16 فیصد آبادی) اور شیڈولڈ ٹرائب میں (8 فیصد آبادی) کیلئے سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کا 22 فیصد کوٹہ مخصوص ہے۔ شیڈولڈ کاسٹس (جدولی ذاتوں) کی مرکزی حکومت کے محکموں میں 17 سے 18 فیصد نشستیں مخصوص ہیں لیکن ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان نچلی ذاتوں کی زیادہ تر تعداد بطور خاکروب کام کر رہی ہے۔ (55 سے 65 فیصد)۔ البتہ تعلیمی اداروں بالخصوص انڈین انسٹی ٹیوٹس آف ٹیکنالوجی اور پوسٹ گریجوایٹ انسٹی ٹیوشن جیسے اعلیٰ اداروں حتیٰ کہ دارالحکومت دہلی تک میں دلتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

انسانی ترقی کے ہر انڈیکس میں دلت اب بھی محروم ترین طبقہ ہیں۔ علاوہ ازیں دلتوں کے بڑھتے عمل دخل اور وسائل کیلئے تیز ہوتے مقابلے کی وجہ سے مختلف طبقات کے درمیان تصادم، تشدد اور زیادتی کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مخصوص نشستیں: نچلی تلی کامیابی

بیوروکریٹک ڈھانچے میں ریزرویشن سسٹم کے اندر کافی خامیاں سامنے آئی ہیں۔ سیاسی قیادت نے اس سسٹم کو ووٹ حاصل کرنے کا ذریعہ تو ضرور بنایا لیکن ریزرویشن کے سسٹم کے مؤثر

نفاذ میں کم ہی دلچسپی لی ہے۔ ذات اور برادری کی شناخت کی بنیاد پر اٹھائے گئے اقدامات معاشرے میں برادری ازم کو فروغ دینے پر منتج ہوئے ہیں۔ سماجی انصاف کے ضمیر کی عدم موجودگی نے سیاسی، تعلیمی اور معاشی شعبوں میں ریزرویشن کے بارے میں انتہائی مضحکہ خیز رویے کو جنم دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ریزرویشن سسٹم کی مساوی حقوق اور مساوی مواقع کے تناظر میں تشریح کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ دلت اپنے اندرونی اختلافات، چپقلشوں اور ذات کے اندر مذہبی اشرافیہ کی موجودگی کے باعث اپنے طاقت مجتمع نہیں کر سکتے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دلتوں کی سیاسی کامیابیوں کی کئی داستانیں ہیں۔ مثلاً اتر پردیش میں بہوجن سماج پارٹی کا حکومت میں آنا، اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ مایاوتی کی 2007 کے ریاستی انتخابات میں وسیع البنیاد برادری اتحاد بنانے میں کامیابی بہوجن سماج پارٹی کی صرف ریاستی سیاست تک محدود رہنے کی بجائے مرکز میں حکومت سازی کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

البتہ بے اختیار اور امتیازی سلوک کا شکار مسلمانوں، عیسائیوں، شیڈول کاسٹس اور جدولی قبائل میں سیاسی اتحاد کی کوئی بصیرت نہیں۔ یہ ایک دوسرے سے دست وگریبان ہیں۔ انتخابی حلقوں کی نئی حلقہ بندیاں چاہے اتفاقی تھیں یا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئیں لیکن بہرحال شیڈول کاسٹس کے مفادات مسلمانوں کے سیاسی مفادات کو نقصان پہنچانے کے درپے نظر آئے۔

مسلسل سماجی استحصال اور جسمانی جارحیت:

دلتوں کی اکثریت اب بھی دیہی علاقوں میں مقیم ہے۔ کل آبادی کا 85 فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے اور ان کا سب سے بڑا مسئلہ آج بھی زمین اور سماجی احترام ہے۔ ذات اور کلاس کے درمیان تصادم کو بھی دلتوں اور جاگیرداروں کی حمایت یافتہ فوج ''رن ویر سینا'' اور ان کے دیگر گروپوں کشمکش کے ساتھ ملا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ ریاستی ادارے بالخصوص پولیس، انتظامیہ اور نظام قانون سماجی تعصب اور اونچی ذاتوں کے طبقاتی مفادات کی عکاسی کرتے ہیں۔ دلتوں کے خلاف زیادتیوں کا دائرہ زبانی گالم گلوچ سے جنسی زیادتی، پینے کے پانی، سرکاری تالابوں، سڑکوں، بس سٹاپوں، مارکیٹوں، ہندوؤں، شہری حقوق تک رسائی سے انکار، جسمانی تشدد اور معاشی بائیکاٹ

تک پھیلا ہوا ہے۔ پولیس اہلکار اکثر دلتوں کے خلاف تشدد کو شہ دیتے ہیں: دوران حراست جنسی زیادتی اور تشدد دلتوں کے خلاف کارروائی کی اکثر رونما ہونے والی شکلیں ہیں۔

بہار کے علاقے بیلچی میں 1977 میں دلتوں کے قتل عام پر پوری قوم کو صدمہ پہنچا۔ اس واقعے میں 11 دلتوں کو تشدد کر کے مار ڈالا گیا۔ ایک بار پھر بیلچی میں ہی 2006 میں ایک ہی خاندان کے 6 افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ 1992 میں راجستھان کے علاقے کمہر کا واقعہ اس سے بھی زیادہ ہولناک تھا جہاں 17 دلتوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ راجستھان میں 2000-2003 کے دوران دلتوں کے خلاف سالانہ 5 ہزار 24 جرائم ریکارڈ کیے گئے۔ 2002 میں تو 46 ہلاکتوں، 134 جنسی زیادتی کے واقعات اور شدید زخمی کرنے کے 93 کیس بھی تھے۔

2006 میں مہاراشٹر کے علاقے خیرلنگی میں ماں بیٹی سمیت دلت خاندان کے 4 ارکان کو اونچی ذات کے ہندوؤں نے بیدردی سے مار ڈالا۔ دلتوں کا قتل عام روکنے میں ناکامی میں پولیس اور ریاستی اداروں کی ساز باز بالکل واضح ہے..... حالانکہ یہ ہائی الرٹ بھی ہوتے ہیں..... بالخصوص ان چار مقتولوں کے پوسٹمارٹم میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا گیا۔ اعلیٰ حکام نے 4 پولیس اہلکاروں اور میڈیکل افسر کو معطل کر دیا تاہم ان کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہ کیا گیا۔ وقوعے کے گواہوں نے شکایت کی کہ مقامی سیاستدان جن کے اونچی ذات کے ساتھ قریبی مراسم تھے نے انہیں ڈرایا دھمکایا جبکہ سرکاری وکیل نے ملزموں کی ضمانت میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ اس کے بعد عوامی سطح پر دلتوں کے بڑے احتجاج کے بعد سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن (سی بی آئی) نے انکوائری اپنے ہاتھ میں لے لی۔

نیشنل کرائم ریکارڈز بیورو (NCRB) جو وزارت داخلہ کے ماتحت ہے نے 2005 کی سالانہ رپورٹ میں انکشاف کیا کہ بھارت میں ہر 20 منٹ کے بعد شیڈولڈ کاسٹ کے خلاف کوئی نہ کوئی جرم ہوتا ہے۔ 2005 میں جدولی ذاتوں کے خلاف جبر کے 26 ہزار 127 کیس درج ہوئے، ایک سال قبل یہ تعداد 26 ہزار 887 تھی۔ 2005 کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس سال 1172 دلت عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی۔ 669 دلتوں کو قتل کیا گیا۔ 1258 اغوا اور 3 ہزار 847 تشدد کے مقدمات درج ہوئے۔ تحفظ شہری حقوق ایکٹ کے تحت 291 مقدمات درج کیے گئے جبکہ 8 ہزار 497 مقدمات کا اندراج شیڈولڈ کاسٹس اینڈ شیڈولڈ ٹرائبز (جبر سے تحفظ) ایکٹ کے تحت ہوا۔

MashalBooks.org

شیڈولڈ کاسٹس اینڈ شیڈولڈ ٹرائبز (پریوینشن آف اٹراسٹیز) ایکٹ 1989:

یہ قانون بالخصوص ذات برادری کی بنیاد پر جسمانی تشدد روکنے کیلئے قائم کیا گیا۔ یہ ایکٹ خصوصی عدالتوں اور پراسکیوٹرز کا ادارہ جاتی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ ایسے سرکاری ملازمین جو اس ایکٹ کے تحت فرائض انجام دینے سے انکار کریں کو ایک سال تک جیل بھیجا جاسکتا ہے۔ یہ قانون زیادتیاں روکنے میں بہت کم موثر ثابت ہورہا ہے اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ زیادتی کے واقعات مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ ایسے مقدمات میں سزا ہونے کی شرح بھی بہت کم ہے۔ اس قانون کے غیر موثر کی عکاسی نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو (این سی آر بی) کی رپورٹ (2005) سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جہاں فرد جرم عائد ہونے کی شرح 94 فیصد ہے وہاں اس ایکٹ کے تحت صرف 30 فیصد مقدمات میں سزا سنائی گئی۔ دلتوں کے خلاف دست درازی کے مقدمات میں 2005 کے دوران 57 ہزار 804 ملزموں کو گرفتار کیا گیا، ان میں سے 46 ہزار 936 کے خلاف فرد جرم عائد کی گئی (82.4) جبکہ صرف 1269 افراد کے خلاف ٹرائل مکمل کیا جاسکا (25 فیصد)۔

اس سے پہلے انسانی حقوق کمیشن نے 2002 میں اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ ''کسی بھی سطح پر اس ایکٹ کے نفاذ کی کوئی مانیٹرنگ نظر نہیں آئی''۔ ایکٹ کے تحت جو نگران کمیٹیاں تشکیل دینا ضروری ہیں وہ یا موجود نہیں یا غیر فعال ہیں۔ پراسیکیوشن کا معیار گھٹیا ہے کیونکہ متعلقہ اہلکاروں کے پاس قابلیت اور عزم دونوں کا فقدان ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے (2000) اپنی رپورٹ میں گجرات کے لسانی حوالے سے حساس 11 اضلاع کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ شیڈول کاسٹس کے تحفظ کے قانون کے تحت 36 فیصد واقعات کا اندراج ہی نہیں کیا گیا۔ 84 فیصد ایسے مقدمات جن پر اس ایکٹ کا اطلاق کیا گیا تھا میں واقعے کی نوعیت چھپانے یا بدلنے کی کوشش کی گئی۔ صرف 53 فیصد مقدمات میں چارج شیٹ کیا گیا۔ 22 فیصد رجسٹرڈ مقدمات بند کردیے گئے جبکہ 92 فیصد کیسوں میں ملزم بری کردیے گئے۔

بھارت میں دلتوں کے خلاف تشدد اور جبر کے واقعات عام ہیں۔ ایسے واقعات کو اکثر چھپایا یا نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یوں دلتوں کو دباؤ پر مقدمات واپس لینے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

شیڈول اور قبائلی کاسٹس کیلئے قومی کمیشن NCSCST

یہ کمیشن ہر سال اپنی رپورٹ صدر جمہوریہ کو پیش کرنے کا پابند ہے جو بعد ازاں پارلیمنٹ کو

MashalBooks.org

بھیج دی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ میں جو رپورٹ پیش کی جاتی ہے اس کا نام ''کئے گئے اقدامات کی رپورٹ'' ہے۔ ملک کی 35 ریاستوں اور خودمختار علاقوں سے حاصل کی گئی رپورٹوں کی صورتحال حوصلہ شکنی ہے۔ صحافی سیناتھ جنہوں نے بھارت کے دیہی سماج پر طویل عرصہ تک رپورٹنگ کی نے ان رپورٹوں تک رسائی کی کوشش کی۔ (سیناتھ 2000)۔ مثال کے طور پر 1999 میں بھارتی پارلیمنٹ نے NCSCST کو رپورٹ پر 1988 میں بحث کی۔ اس وقت تک بیشتر کیس عدم ثبوت کی بنا پر عدالتوں سے خارج کئے جا چکے تھے۔ کئی بڑے اشتہاری قاتل بری ہو گئے اور کئی متاثرین کو دباؤ ڈال کر کیس واپس لینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر راجستھان کے گاؤں کمہر میں قتل عام کے 8 سال بعد 40 وزرا اور 250 ارکان پارلیمنٹ نے وہاں کا دورہ کیا اور متاثرین کو کیس واپس لینا پڑے۔

درسی کتب تعصب کو بڑھاوا دے رہی ہیں

سکولوں اور گریجوایٹ سطح کیلئے منظور کردہ درسی کتب طلبا کو نئے تعصب سے روشناس کرا رہی ہیں اور موجودہ تاریخی تفریق اور عدم برداشت کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ حتیٰ کہ محروم طبقوں کے خلاف تشدد کو شہ دینے کا موجب بن رہی ہیں۔ ایسی درسی کتابیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کئی مذہبی، لسانی اور طبقاتی اقلیتوں کے درمیان اختلافات کی منطق فراہم کرتی ہیں۔

بھارتی درسی کتابوں میں ذات برادری کے حوالے سے اچھوتوں کے تصور کی وضاحت سرے سے کی ہی نہیں گئی یا بہت کم کی گئی ہے۔ چاہے یہ گجرات سٹیٹ ایجوکیشن بورڈ ہو یا انڈین سرٹیفکیٹ آف سیکنڈری ایجوکیشن ہو۔ درسی کتابیں قدیم دور کے ''ورنا نظام'' کی جدید دور کی بھارتی سماجی حقیقت کے ساتھ تعلق کو اجاگر کرنے میں تامل کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں۔

''ورنا سسٹم آریاؤں کی طرف سے بنی نوع انسانیت کیلئے ایک بیش قیمت تحفہ تھا۔ یہ محنت کی تقسیم کے اصول کی بنیاد پر استوار معاشرے کی سماجی اور معاشی تنظیم سازی تھی۔ علم، دفاع، تجارت، زراعت اور کمیونٹی کی خدمت سماجی دھارے کے ناگزیر حصے تھے تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ورنا سسٹم میں بدعنوانی پھیل گئی اور پیشے سے ہٹ کر بھی پیدائش کو ورنا سسٹم کا منفرد عضو تسلیم کر لیا گیا۔ یوں معاشرہ مستقل طور پر مختلف طبقوں کی اشرافیہ میں تقسیم ہو گیا۔ مصلحین کی طرف

سے انہیں ہٹانے کی کوششوں کے باوجود یہ شناختیں برقرار رہیں۔اس کے باوجود معاشرے کے سماجی اور معاشی ڈھانچے کی تعمیر کیلئے ورنا کی ایک مثالی نظام کے طور پر اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔''

گجرات سٹیٹ بورڈ جماعت نہم کی سوشل سٹڈیز کی کتاب میں برادری سسٹم کی برائی کا الزام متاثرین پر عائد کیا گیا ہے جیسا کہ اس جملے سے پتہ چلتا ہے۔

''جدولی ذاتوں اور قبائل کے مسائل: یقیناً ان کی جہالت، ناخواندگی اور اندھے عقیدے کو ان کی ترقی میں رکاوٹ کا ذمہ دار سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ لوگ زندگی میں اب بھی تعلیم کی اہمیت کا ادراک نہیں کرسکے''۔

پورے بھارت کا درسی معیار طے کرنے والے ادارے انڈین سرٹیفکیٹ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے سوشل سٹڈیز کے مضمون میں بھی ایسے ہی تعصب کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔

''سیاہ رنگت والے اصل باشندے شودر تھے، معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ جس کا فرض اعلیٰ طبقے کی خدمت کرنا تھا''۔

ٹیسٹا ستیل داڈ جنہوں نے 1999 میں درسی کتب کا جائزہ لینے کے معاملے کی نگرانی کی تھی نے کہا کہ:

''زیر بحث مفروضہ یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان کے قدیم زمانے میں مقیم افراد کی اکثریت ہندو تھی جیسا کہ آج بھی ہے۔ دراوڑی اور آریائی عقائد اور تہذیبوں کے درمیان تصادم صرف نمایاں ہی نہیں بلکہ انہیں اس خواہش کے تحت نامعاندانہ کہا جاتا ہے کہ ہندومت پرامن انداز میں تصادم اور اختلافات کو اپنے اندر جذب کرسکتا تھا''۔

گجرات سٹیٹ بورڈ برائے جماعت نہم کے معاشرتی علوم کے مضمون میں شیوا۔بودھ تصادم، خواتین شودروں اور دلتوں سے بدسلوکی کے بارے میں تاریخی تفصیل نہیں شامل کی گئی۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''ہندوستانی ثقافت کی رواداری اور ورثے میں ملنے والا امن اس کے خواص میں شامل ہے۔

MashalBooks.org

بنگلہ دیش

شہری، ثقافتی اور معاشی حقوق کا استحصال:

بنگلہ دیش کا قوم پرستی کا جارحانہ خواب جیسا کہ مقبول لیڈر شیخ مجیب الرحمان نے بیان کیا تھا یہ تھا کہ مسلمان، ہندو اور عیسائی بنگالیوں کیلئے الگ وطن قائم کیا جائے (اور اصل باشندوں کیلئے یہ آپشن کہ وہ یا تو قومی دھارے میں جذب ہو جائیں یا پھر محرومی کا شکار رہیں) لیکن نئی ریاست کے استحکام کا عمل.....جس میں مذہب، زبان اور نسل کی یکسانیت کو ترجیح دینا معمول ہے۔ آئے روز اقلیتوں کی بے دخلی اور عدم تحفظ کی صورت میں نکلا ہے۔ آئین میں بار بار ترامیم کے ذریعے اقلیتوں کے شہری، معاشی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کا استحصال کیا گیا۔ بنگلہ دیش کے افشاں چودھری جیسے زیادہ رجائیت پسند دانشوروں نے آئین میں پے در پے ترامیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''آئین میں نہ جبر کی اجازت دی گئی ہے نہ اس سے روکا گیا ہے''۔

شیخ مجیب کے بعد آنے والی حکومتوں چاہے وہ جمہوری تھیں یا آمرانہ نے اختیارات پر گرفت جمانے کیلئے ملک کو تسلسل کے ساتھ یک لسانی اور کسی حد تک یک مذہبی برتری کی طرف دھکیلا۔ جیسا کہ آئین میں آٹھویں ترمیم کے تحت آرٹیکل 3 میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ سرحد پار سیاست کے محرکات نے سرکاری شعبے پر بنیاد پرست قوتوں کے غلبے کے رجحان کو تقویت پہنچائی ہے: بھارت میں ہندو قوم پرستی کے مضبوط ہونے سے بنگلہ دیش میں اسلامی بنیاد پرستی کے رویے کو مضبوط کیا ہے۔ یوں سرحد کے دونوں طرف اقلیتوں کو تباہ کن صورتحال کا سامنا ہے۔

MashalBooks.org

زمین کیلئے بڑھتی طلب اور جمہوری سیاست کے دباؤ پر قبائلی علاقوں میں سرکاری سرپرستی میں آبادکاری کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اقلیتوں کی زمینوں اور املاک پر ''قانونی'' قبضے کی روایت نے جنم لیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے رجحان کے باعث قبائلی علاقوں کی ترقی کے وسائل پر دباؤ بڑھا ہے جس سے خطرات کا شکار گروہوں کو مزید خطرات لاحق ہوئے ہیں۔

ہندوؤں کی ''گمشدگی''، چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں میں دو عشروں سے جاری خودمختاری کی لڑائی اور احمدی اقلیت کے خلاف قانونی کارروائیاں بنگلہ دیش میں اقلیتوں کو درپیش امتیازی سلوک اور عدم تحفظ کے واضح ثبوت ہے۔ بلاشبہ بنگلہ دیش میں بنیاد پرست اسلام پسند اور لسانی مذہبی قوتوں کے خلاف جمہوری مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اس کا اظہار احمدی کمیونٹی پر پابندی (مراد غیر قانونی قرار دینا) اور توہین مذہب قانون متعارف کرانے کی مخالفت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ویسٹڈ پراپرٹیز ایکٹ (1974) اور چٹاگانگ امن معاہدے کے خلاف مثبت مخالفت بھی سامنے آئی ہے۔

سیاسی نمائندگی:

بنگلہ دیش کے پرتشدد سیاسی منظرنامے پر دو سیاسی جماعتوں کا غلبہ ہے۔ ایک عوامی لیگ اور دوسرے بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی ہے۔ چونکہ بنگلہ دیشی سیاست کا یہ خاصہ ہے اس لئے تشدد کی روایت سے اقلیتیں مزید خطرات کا شکار ہیں۔ عوامی لیگ جس نے آزادی کی تحریک کی قیادت کی تھی اور سیکولر نظریات کی حامل ہے نے مضحکہ خیز انداز میں اقلیتوں کو ووٹ بنک کے طور پر استعمال کیا جس سے وہ مخالف جماعت بی این پی کے حملوں کا شکار ہوتی ہے کیونکہ بی این پی نے اسلام پسندوں کے ساتھ اتحاد کر رکھا ہے۔ اس سیاسی دیومالا کہ ہندو برادری کا ووٹ بنک عوامی لیگ کیلئے مختص ہے کے معائنے کیلئے گزشتہ عشرے میں ہونے والے انتخابات کے ووٹنگ کے انداز کو جانچنے کی ضرورت ہے۔ سیاسی تجزیہ نگار شمس العارفین کے مطابق پارلیمنٹ کی 134 نشستوں کو ''اقلیتی نشستیں'' کہا جاتا ہے کیونکہ ان حلقوں میں 10 سے 12 فیصد غیر مسلم باشندے مقیم ہیں۔ ان میں سے 1991 میں عوامی لیگ نے 54 اور 1996 میں 81 نشستیں حاصل کیں تاہم 2001 میں ان کی تعداد ڈرامائی طور پر کم ہوکر 32 ہوگئی۔ اسی دوران بی این پی نے 1991 میں اقلیتوں

کی 46 نشستیں حاصل کیں جو 1996 میں کم ہو کر 20 رہ گئیں۔ پھر 2001 میں بی این پی نے ملک کی سب سے بڑی اسلامی سیاسی پارٹی جماعت اسلامی کے ساتھ اتحاد کر کے 90 سیٹیں جیت لیں۔

اس کے علاوہ 1991 کے الیکشن میں تمام اقلیتی ارکان پارلیمنٹ کا تعلق عوامی لیگ سے تھا (5 ہندو اور 3 چٹاگانگ کے قبائلی ارکان)۔ 1997 میں نمائندگی کی یہ تعداد کم ہو کر 7 ہو گئی کیونکہ ایک رکن بی این پی کا تھا۔ 2001 میں عوامی لیگ کے 2 مزید اقلیتی ارکان کم ہوئے اور باقیماندہ 2 نشستیں بی این پی کو ملیں جن میں چٹاگانگ کی چکمہ کمیونٹی کے رکن موتی سوا پن دیوان شامل تھے۔

شراکت کی حدود

بنگلہ دیش میں سول سروس، فوج میں ملازمت اور سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے لئے غیر مسلم اقلیتوں کو کم مواقع حاصل ہیں۔ حکومت نے سول سروس کے حساس عہدوں پر مذہبی اقلیتوں کو فائز نہیں کیا۔ پبلک سروس سلیکشن بورڈز میں بھی اقلیتی ارکان کی نمائندگی کم ہے۔ سرکاری ملکیت بنگلہ دیش بنک میں اعلیٰ عہدوں پر اندازاً 10 فیصد غیر مسلم عہدیدار ہیں۔ شعبہ تدریس میں ہندوؤں کو برتری حاصل ہے۔ اگرچہ ملازمین کو اپنا مذہب ظاہر کرنے کی اجازت نہیں لیکن کسی شخص کے نام سے ہی مذہب کا پتہ چل جاتا ہے۔

300 نشستوں پر مشتمل بنگلہ دیشی پارلیمنٹ میں مذہبی اقلیتوں کی 6 سیٹیں ہیں۔ 4 عوامی لیگ اور 2 بی این پی کے پاس ہیں۔ موجودہ حکومت میں 3 غیر مسلم ارکان نائب وزیر یا وزیر مملکت ہیں۔ بڑی سیاسی جماعتوں کے بڑے عہدوں پر چند ہی غیر مسلمان فائز ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی ریاستی ادارے کا سربراہ کوئی غیر مسلم ہو۔

مذہبی اداروں کا حکومت کے پاس رجسٹریشن کرانا لازمی نہیں تاہم تمام غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی ''این جی او آفیئرز بیورو'' کے پاس رجسٹریشن حاصل کرنا لازم ہے اور وہ اسی صورت میں غیر ملکی امداد حاصل کر سکتی ہیں۔ حکومت نے 2003 میں عارضی طور پر این جی اوز کی رجسٹریشن اس الزام کے بعد عارضی طور پر معطل کر دی تھی کہ این جی اوز کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ہندو بڑی تعداد میں ہیں (یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ)۔ ملک میں حکومتی امداد سے ملنے والا کوئی عیسائی، ہندو یا بودھ سکول موجود نہیں۔ وزارت داخلہ نے کمرشل بنکوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ

MashalBooks.org

بھارتی سرحد سے ملحقہ علاقوں میں ہندو تاجروں کو بڑی مقدار میں کاروباری قرضے جاری نہ کریں۔ یہ ہدایات دسمبر1992 میں بابری مسجد شہید کرنے کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی کے تناظر میں جاری کی گئیں۔عمومی طور پر تجارت اور بنکوں سے قرضوں کے اجرا کیلئے اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

1993 میں ہندو کمیونٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے ایک اور ہتھکنڈے کے طور پر خفیہ املاک کا سروے شروع کیا گیا جس سے ہندو اقلیت سرکاری حکام کے رحم وکرم پر چھوڑ دی گئی۔ پہاڑی باشندوں کو مارکیٹ میں جانے کیلئے کرفیو پاس لینا پڑا۔ جو پہاڑی باشندہ ''بنگلہ دیش میری جان ہے'' کا نعرہ لگاتا تھا اسے محدود نقل وحرکت کی اجازت تھی۔

اقلیتیں، عدلیہ اور پولیس

بنگلہ دیش میں آزاد عدلیہ کی موجودگی کی بات کی گئی ہے تاہم آئین کی طویل عرصے سے ایک ''عارضی'' شق کے تحت ماتحت عدلیہ بدستور انتظامیہ کے ماتحت اور اس کے زیر اثر رہی۔21 جون 2001 کو سپریم کورٹ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنے کے ہائیکورٹ کے فیصلے کی توثیق کردی۔

آرٹیکل 27 کے مطابق قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں لیکن آدی واسیوں، ہندوؤں اور احمدیوں سمیت اقلیتوں کے خلاف تشدد کی حوصلہ افزائی کا رجحان عام ہے۔2003 میں چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں کے مکینوں کی ہلاکت، جنسی زیادتی اور سینکڑوں گھر نذر آتش کرنے کے واقعے کی کوئی آزادانہ انکوائری نہیں کرائی گئی۔ ضلع جیسور کے علاقے میں اکتوبر2003 میں رگھاناتھ پور بک کی احمدی عبادتگاہ کے امام شاہ عالم کے قتل میں ملوث عناصر کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا۔ کئی مواقع پر پولیس نے احمدیوں کی عبادتگاہوں پر قبضہ کرنے کی کوششوں پر کارروائی نہیں کی۔21 نومبر اور 5 دسمبر2001 کو مولانا محمد حسین ممتاز کی سربراہی میں ختم نبوت کے ہزاروں افراد نے ڈنڈے اور اینٹیں پکڑ کر ڈھاکہ کے علاقے تیج گاؤن میں احمدیوں کی عبادتگاہوں پر چڑھائی کی کوشش کی۔ اگرچہ2003 میں بن سکھیلی اپاضلع میں ہندوؤں کے گھر جلانے کے الزام میں کئی افراد کو حراست میں لیا گیا لیکن کسی کو ان گرفتار افراد میں بڑے ملزموں کی

MashalBooks.org

عدم موجودگی پر تشویش نہیں ہوئی۔ دسمبر 2001 میں بنیار چر ضلع گوپال گنج میں ایک چرچ میں اتوار کی سروس کے دوران بم حملے کی انکوائری کیلئے ایک عدالتی کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کی رپورٹ میں شیخ حسینہ واجد کی جماعت کے ارکان کو 1999، 2000، 2001 کے بم دھماکوں اور 21 جون کے چرچ حملے پر موردالزام ٹھہرایا گیا تاہم 3 رکنی کمیشن کے 2 ارکان منحرف ہوگئے اور کہا کہ جسٹس باقی سرکار نے رپورٹ میں اپنے ذاتی خیالات درج کئے۔

اقلیتوں کے خلاف تشدد کے کئی واقعات میں پولیس حملہ آوروں کی پشت پناہی کرتی نظر آتی ہے جیسا کہ اپریل 2005 میں احمدی عبادتگاہوں پر حالیہ حملوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک شر پسندانہ طرز عمل اس وقت ابھرا جب ایک ہجوم نے دھاوا بول کر احمدیوں کی مسجد کو عبادتگاہ لکھنے کا بورڈ آویزاں کیا اور اس عمل میں پولیس نے ان کی معاونت کی۔ پولیس کا موقف تھا کہ ہجوم کو کنٹرول کرنے کا یہ احتیاطی اقدام تھا۔

کم شدت کا تشدد:

1991 کی خلیجی جنگ کے دوران بنگلہ دیش کے عیسائیوں اور غیر ملکیوں پر حملے کئے گئے۔ کئی چرچوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ 1993 سے 1995 تک انتہا پسند مسلمان تنظیموں نے اقلیتوں اور روشن خیال قوتوں پر اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین کے الزام میں حملے کئے۔

1992 میں بھارت میں بابری مسجد کے انہدام کے تناظر میں ڈھاکہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ تصادم کے دوران بنگلہ دیشی حکومت نے لوٹ مار، جلاؤ گھیراؤ، خواتین سے زیادتی اور مندروں کی تباہی کے واقعات کی مذمت نہ کی۔ اپوزیشن سیاسی جماعتوں نے بھی متاثرہ (اقلیتی) افراد کے ساتھ انصاف کا کبھی مطالبہ نہ کیا۔ جب اقلیتوں نے حملوں اور مندروں کی تباہی کی شکایات کیں تو بھی شہری اور دیہی علاقوں کی انتظامیہ غیر فعال اور خاموش رہی۔

بنگلہ دیش ہندو۔ بودھ۔ عیسائی یونٹی کونسل نے اپریل 1992 میں اپنے سالانہ اجلاس میں دعویٰ کیا کہ گزشتہ 20 سال کے دوران اقلیتی گروپوں کے 50 لاکھ افراد کو بھارت جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جبکہ دوسرے نمبر پر سنتھالی قبائلی تھے جنہیں جبر و تشدد سے ان کی آبائی زمینوں سے بیدخل کر دیا گیا۔ جون 2001 میں بنیار چر ضلع گوپال گنج میں ایک گرجا

MashalBooks.org

گھر میں اتوار کی عبادت کے دوران بم دھماکہ ہوا جس سے 10 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہو گئے۔ بم دھماکہ ہونے کے 10 گھنٹے بعد فوجی ٹیم وہاں تحقیقات کرنے آئی۔ پولیس نے کئی مشتبہ افراد کو حراست میں لیا تاہم انکوائری میں کوئی پیشرفت نہ ہوئی جس پر ایک عدالتی تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیا گیا۔

2001 کے انتخابات کے بعد شکست خوردہ بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے کارکنوں نے عوامی لیگ کو ووٹ دینے کا انتقام لینے کیلئے کئی ہندو دیہات پر حملے کئے۔ ان واقعات میں قتل، خواتین سے زیادتی، لوٹ مار اور تشدد شامل تھے۔ اس کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد میں ہندوؤں کو سرحد پار کر کے نقل مکانی کرنی پڑی۔ اسی سال ہائیکورٹ نے حکومت کو حکم دیا کہ اقلیتوں پر حملوں اور ان کے تحفظ کے اقدامات پر رپورٹ پیش کی جائے۔ حکومت نے (2002) اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ تشدد کے واقعات کا فرقہ واریت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ کہ تشدد کی رپورٹیں بڑھا چڑھا کر پیش کی گئیں یا سرے سے بے بنیاد تھیں۔

چٹاگانگ کے علاقے میں 2003 میں ایک ہندو گھر کو آگ لگا دی گئی جس سے گھرانے کے 11 افراد زندہ جل کر ہلاک ہو گئے۔ سرکاری حکام نے اس واقعے کا ذمہ دار ڈاکوؤں کو ٹھہرایا لیکن اپوزیشن پارٹی عوامی لیگ نے الزام لگایا کہ اس واقعے میں بی این پی کے کارکن ملوث تھے۔ حکومتی وزراء نے کئی روز بعد جائے وقوعہ کا دورہ کیا اور پولیس نے 5 ملزموں کو گرفتار کر لیا جس میں سے 3 نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبال جرم کر لیا۔

26 اگست 2003 کو چٹاگانگ معاہدے کے بعد میدانی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بنگلہ دیشی آبادکاروں نے سکیورٹی فورسز کی معیت میں پہاڑی دیہات پر دھاوا بول دیا۔ یہ واقعہ چکمہ قبیلے کی ایک لڑکی کے ہندو بنگالی آبادکار کے ہاتھوں اغواء کا شاخسانہ تھا۔ چکمہ قبائلیوں نے اس کے جواب میں ہندو تاجر کو اغواء کر لیا۔ 5 دیہات پر حملے کئے گئے۔ عبادتگاہوں سمیت 231 گھر نذر آتش کئے گئے۔ 400 خاندان متاثر ہوئے۔ وہاں امدادی سرگرمیوں میں شریک این جی اوز نے تصدیق کی پہاڑ ٹولی اور باپو پارہ میں 10 چکمہ خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی۔ 2 افراد اور 8 ماہ کے بچے کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ لوگوں پر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا گیا اور ان کے گھروں کو آگ لگائی گئی۔ ان کو بے گھر چھوڑ دیا گیا اور ان کے اثاثوں کو یا تو لوٹ لیا گیا یا آگ لگا دی گئی۔

MashalBooks.org

11 مارچ 2005 کو احمدیوں کو حکومت کی طرف سے غیر مسلم قرار دینے کے مطالبے کے دوران ملک کے طول وعرض میں مظاہرے ہوئے اور بوگرہ میں ایک مشتعل ہجوم نے احمدی مسجد سے مسجد کا بورڈ اتار کر عبادتگاہ کا بورڈ آویزاں کرنے کی کوشش کی۔ پولیس نے ہجوم کو کنٹرول تو کرلیا لیکن مسجد کا بورڈ بہرحال اتار لیا گیا تاہم چند گھنٹوں بعد پولیس بورڈ دوبارہ بحال کر دیا۔

''لاپتہ'' ہندو:۔

آزادی کی جنگ کے دوران الگ وطن کے قیام کیلئے ہندوؤں نے بھی بنگالی مسلمانوں کے ساتھ مشترکہ کاز پر جدوجہد کی۔ قوم پرستی کے تصور میں بنگالی نسل پرستی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ البتہ نومولود ریاست کو اسلامی طرز کی طرف تیزی سے لے جانے کے رجحان نے مذہبی اقلیتوں کو ایسی صورتحال میں چھوڑ دیا جہاں آزاد بنگلہ دیش میں ان کی کوئی سیاسی یا معاشی حیثیت نہیں۔ ہندوؤں کی آبادی ایک کروڑ 20 لاکھ یا کل آبادی کا 10 فیصد تھی۔ بنگلہ دیش میں اقلیتوں کی حیثیت کے ایک مئورخ سلیم احمد لکھتے ہیں کہ: ''حکمران طبقے کی طرف سے فرقہ واریت کی حوصلہ افزائی سے اکثریت نے اقلیت کو زمینوں اور ملازمتوں سے بے دخل کرنے کی روایتی چال چلنا شروع کردی''۔ سماجی اور معاشی مواقع میں کمی اور ہر سطح پر کم شدت کی جارحیت نے.... ریاست کی طرف سے امتیازی اقدامات سمیت.... ہندوؤں کو نقل مکانی کر کے بھارت جانے پر مجبور کر دیا۔

1941 کی مردم شماری میں مشرقی پاکستان کی آبادی میں ہندوؤں کی تعداد 28 فیصد تھی۔ 1974 کے اعداد وشمار کے مطابق یہ شرح کم ہو کر 13 فیصد اور 1991 میں مزید کمی کے ساتھ 10 فیصد ہوگئی۔ سماجی امور کے ماہرین نے ''لاپتہ'' ہندوؤں کے مظہر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ہندوؤں کو جبراً نقل مکانی پر مجبور نہ کیا جاتا تو 1971 میں ان کی آبادی 9.6 ملین کی بجائے 11.4 ملین ہوتی اور 1981 میں ...سرکاری دستاویزات کے مطابق.... بڑھ کر 14.3 ملین ہو جاتی (12.5 ملین 1981 میں جمع 1.8 ملین 1964 سے 1971) جبکہ 1981 میں درحقیقت یہ آبادی 10.6 ملین رہی۔ 1941 کی مردم شماری میں اس علاقے میں جہاں مشرقی پاکستان اور بعدازاں بنگلہ دیش وجود میں آیا ہندوؤں کی آبادی 28 فیصد تھی تاہم 1974 کے اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ آبادی 13 فیصد کم ہوئی اور 1991 میں گر کر 10 فیصد تک آ گئی۔ یوں 1964 سے 1991 کے درمیان

لاپتہ ہندو افراد کی تعداد 50 لاکھ 30 ہزار نفوس تھی۔ گویا ہر سال ایک لاکھ 96 ہزار 296 ہندو لاپتہ ہوئے۔ باالفاظ دیگر یومیہ 538 ہندو کم ہوئے۔

ہندوؤں کی گمشدگی کی وجوہات میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، جبر و تشدد اور جبری نسلی لسانی نسل کشی ہیں۔ ہندو اس وقت ہمسایہ ملک بھارت فرار ہونے لگے جب بنگلہ دیش حکومت نے ویسٹڈ پراپرٹی ایکٹ کے تحت ان کی زمینیں ''قانونی'' طور پر ہتھیا لیں۔

ویسٹڈ پراپرٹی ایکٹ:

یہ ایکٹ 1965 میں ہندو پاک جنگ کے بعد مشرقی پاکستان میں ''املاک دشمن ایکٹ'' کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اس کا بادی النظر میں مقصد زندگی کو لاحق خطرات کے باعث بھارت فرار ہونے والے ہندوؤں کی املاک پر قبضہ کرنا تھا۔ اس کا اطلاق پاکستان میں مقیم ایسے بھارتی باشندوں یا بھارت میں مقیم ایسے پاکستانی شہریوں پر ہوتا تھا جنہیں ''پاکستان کا دشمن'' قرار دیا گیا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''دشمن'' کا غیر مناسب لفظ استعمال ہونے کے باوجود یہ قانون Bangledes(Vesting of property and assests)Order 1972 اور اس کے بعد Continuance enforcement order 1971 Vested and Non-Resident Property 1974 (Administration) Act کے طور پر مختلف ناموں سے موجود رہا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی زیادہ احتجاج یا تنقید نہیں کی گئی۔

یہ قانون ریاست کو ان جائیدادوں کا انتظام سنبھالنے کی اجازت دیتا ہے جن کے پاکستانی یا بھارتی مالکان انہیں چھوڑ کر جا چکے ہوں۔ جہاں پہلے ریاست صرف ''نگران'' تھی وہاں اب یہ 1976 کی ترمیم کے نتیجے میں ایسی تمام املاک کی مالک بن گئی ہے۔ 1976 اور 1991 کے تحت جو املاک قبضے میں لی گئیں وہ مالیت میں اس وقت کی جائیدادوں سے زیادہ تھیں جب ملک مشرقی پاکستان تھا کیونکہ حکومت نے ان ہندوؤں کی جائیداد قبضے میں لی جو نقل مکانی کر چکے تھے یا کرنے کے خواہاں تھے چنانچہ یہی ایکٹ دیہی اشرافیہ کے ہاتھوں ہندوؤں کو بے گھر کرنے کا ہتھیار ثابت ہوا۔

این جی او ''اے ایس کے'' نے ''اقتدار، تحفظ اور اقلیتیں'' کے عنوان سے اپنی رپورٹ (2008) میں لکھا ہے کہ 1999 میں ہندوؤں کی اراضی پر زبردستی قبضے کے 29 کیس ہوئے۔ میمن

MashalBooks.org

سنگھ کے علاقے میں 29 ہزار 700 ایکٹر متروکہ اراضی میں سے 28 ہزار ایکٹر اور 400 مکانات صرف ایک بااثر شخص نے ہتھیا لئے۔ اس بات سے بہت کم فرق پڑتا ہے کہ کون اقتدار میں ہے۔ 1995 میں بی این پی کے کارکنوں کے پاس 72 فیصد جائیدادوں کا کنٹرول تھا جبکہ 1998 میں عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے افراد نے 42 فیصد متروکہ جائیدادیں ہتھیالیں۔ بنگلہ دیشی پارلیمنٹ کو متروکہ جائیداد کی واپسی ایکٹ (2001) منظور کرنے میں 30 سال لگ گئے۔ یہ قانون کہتا ہے کہ قبل ازیں قانون کے تحت جو جائیدادیں حکومتی کنٹرول میں تھیں وہ اصل مالکان کو واپس دی جائیں گی تاہم اصل مالکان یا ان کے ورثا مقامی شہری ہوں۔ وہ ہندو جو فرار ہوئے بھارت چلے گئے ان کے نقصان کا کوئی ازالہ نہیں ہوا۔ قانون کے تحت لازمی تھا کہ وہ اکتوبر 2001 تک متروکہ جائیدادوں کی فہرست تیار کرے۔ 2002 میں ویسٹڈ پراپرٹی ریٹرن ایکٹ میں ترمیم کی منظوری دی جس کے تحت حکومت کو جائیدادوں کی واپسی کیلئے غیر معینہ مہلت دے دی گئی ہے۔ ڈپٹی کمشنروں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ متروکہ جائیدادوں کی اصل مالکان کو واپسی تک انہیں لیز پر دے دیں۔

خطرے سے دوچار کمیونٹی

احمدی کمیونٹی کے افراد مرزا غلام احمد قادیانی (1839-1908) کے پیروکار ہیں جنہوں نے اواخر انیسویں صدی میں برصغیر میں ایک نئی مذہبی کمیونٹی کی بنیاد رکھی۔ 1891 میں مرزا غلام احمد نے خود کو ''مصلح عصر'' قرار دیا جس کی پیشگوئی (ان کے خیال میں) مختلف مذہبی صحیفوں میں کی گئی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو احمدی فرقہ 2 گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک قادیانی اور دوسرا لاہوری تھا۔ قادیانی کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد (نعوذ باللہ) پیغمبر تھے۔ مسلمانوں کا بڑا طبقہ احمدیوں کو بدعتی سمجھتا ہے۔ (نوٹ کتاب کے مصنف کے الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے، مترجم یا پبلشر کا متفق ہونا ضروری نہیں: ایم وسیم)۔

بنگلہ دیش میں اندازاً 10 ہزار احمدی ہیں جو مذہبی آزادی اور آزادانہ عبادت اور اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں جیسا کہ بنگلہ دیش کے آئین کے آرٹیکل 31 اور 41 نے ہر شہری کو ضمانت دی ہے۔ 2003 کے بعد سے اسلام پسند تنظیموں کی قیادت کی شہ پر احمدیوں کے خلاف حملوں اور انہیں ہراساں کرنے کے واقعات میں تیزی آئی ہے۔ پولیس کی طرف سے

MashalBooks.org

ناکافی تحفظ کے اشارے بھی ملے ہیں۔ ایک منظم مہم بھی چلائی جارہی ہے کہ (پاکستان کی طرح) احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔

اکتوبر 2003 میں کشتیا کے علاقے میں 17 احمدی خاندانوں کو کئی روز تک ان کے گھروں میں محصور رکھا گیا۔ تیج گاؤں ڈھاکہ میں نومبر 2003 میں پولیس نے 5 ہزار اسلام پسند کارکنوں کو احمدی مسجد مسمار کرنے سے روک دیا۔ دسمبر 2003 میں احمدی مخالف مہم کے ایک رکن نے جیسور میں ممتاز احمدی لیڈر کو قتل کر دیا۔ مئی 2004 میں ختم نبوت اندولن تنظیم جو احمدی مخالف علما کی قیادت میں قائم ہے نے ہزاروں احمدیوں کو گھروں سے بیدخل کرنے اور ان کی مساجد پر حملے کرنے کی دھمکی دی۔ اکتوبر 2004 میں پولیس اور نیم فوجی دستوں نے احمدی مخالف دو گروپوں کے حمایتیوں کو ڈھاکہ کے قریب ایک قصبے میں احمدی مسجد پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ چند روز بعد ایک اور مسجد پر قبضہ کرنے کی کوشش کے دوران 11 احمدیوں کو زخمی کر دیا گیا۔ اپریل 2005 میں احمدیوں کے خلاف کئی کارروائیاں دیکھنے میں آئیں جس دوران پولیس کی طرف سے درکار تحفظ کی فراہمی میں ناکامی کا بھی ثبوت ملا۔ پولیس نے ایک گروپ کی 2 مرتبہ مدد کی جو احمدیوں کی عبادتگاہ پر بورڈ لگانا چاہتا تھا کہ ''یہ مسجد نہیں صرف احمدیوں کی عبادتگاہ ہے''۔ (مراد یہ ہے کہ مسجد کا لفظ صرف مسلمانوں کی عبادتگاہ کیلئے مخصوص ہے: مترجم)۔ حکومت نے احمدیوں کی اشاعتی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کیلئے ایک حکمنامہ جاری کرنے کی کوشش کی تاہم انسانی حقوق کے کارکنوں کی رٹ پر ہائیکورٹ نے اس پر عملدرآمد روک دیا۔ البتہ مجموعی طور پر عدالتوں کے فیصلوں میں اکثریت کی اقدار اور تعصب کی عکاسی ہوتی ہے۔

بنگلہ دیش میں 1999 میں انجمن احمدیہ بنام بنگلہ دیش کیس میں ہائیکورٹ کے ڈویژن بنچ نے احمدی کمیونٹی کی مقدس کتاب پر سنی اکثریت کے مذہبی جذبات مجروح کرنے پر ضابطہ فوجداری کے تحت پابندی کے اقدام کو برقرار رکھا۔ اپنے فیصلے میں عدالت نے قرار دیا کہ ''اگرچہ احمدی کمیونٹی کو اپنے عقیدے کی ترویج اور تبلیغ کا حق حاصل ہے لیکن مذہبی آزادی سے دیگر مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو مشتعل نہیں کرنا چاہیئے''۔ بنگلہ دیش کی شہری آزادیوں کی علمبردار سارہ حسین نے برداشت میں کمی، مخالفین کو چپ کرانے اور ایک ہی شکل کے اسلام کے نفاذ کے حوالے سے مذہبی حقوق کی حکمت ہائے عملی کا تجزیہ کرتے ہوئے 3 اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ''کسی فرد یا گروہ کو

خاموش کرانے کیلئے فوجداری قوانین کو استعمال کرنا، انکے خلاف عدم برادشت کا ماحول پیدا کرنا اور نئے ڈریکولائی قوانین کے نفاذ کیلئے عوامی جذبات کو متحرک کرنا' 2004 میں سارہ حسین نے لکھا کہ ''اعلیٰ عدلیہ نے ایسے حملوں کا نشانہ بننے والوں کو ریلیف پہنچایا ہے اور پارلیمنٹ نے بھی ابھی تک بڑی قانونی ترامیم کی منظوری نہیں دی'' (سارہ حسین 2004)۔

بہاری مسلمان: بنگلہ دیش میں بے خانماں

بہاری مسلمان بنگلہ دیش میں نسلی لسانی اقلیت ہیں لیکن انہیں سرکاری مردم شماری میں اس لئے نہیں گنا جاتا کیونکہ قانون کی نظر میں ان کا اپنا کوئی ملک نہیں۔ یہ لوگ ان 7 لاکھ اردو بولنے والے بہاری مسلمانوں کی اولاد میں ہیں جنہوں نے 1947 یا اس کے بعد بھارتی صوبہ بہار سے ہجرت کر کے بنگلہ دیش میں سکونت اختیار کی۔ یہ لوگ بنگلہ دیش کے طول وعرض میں بکھرے کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس سرزمین کو جانے کے منتظر ہیں جس نے ابھی تک انہیں تسلیم نہیں کیا یعنی پاکستان۔ 1992 کو کرائے گئے ایک سروے کے مطابق ان بہاریوں کی تعداد 2 لاکھ 38 ہزار ہے اور وہ بنگلہ دیش کے 22 اضلاع کے 66 کیمپوں میں پناہ گزین ہیں۔ (تاج دین 1999)۔ 1971 میں بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد انہوں نے 1973 میں پاکستان کو اپنا ملک قرار دیا اور یوں بنگلہ دیش میں بے وطن قرار پائے۔

بہاری باشندے نظریاتی اور لسانی حوالے سے پاکستان سے منسلک ہیں۔ ایک مسلمان وطن کی تلاش میں انہوں نے پاکستان کو ترجیح دی لیکن بنگالیوں کے سمندر میں گم ہو گئے۔

''میاں، کوئی بنگالی تمہیں دل سے نہیں قبول نہیں کر سکتا۔ وہ آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن وہ خود اپنے طور پر یکجان ہیں۔ آپ ہماری مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں تنہا کر دیا گیا، لوٹا گیا اور ہمارے وطن سے نکال باہر کر دیا گیا۔ پاکستان نے بھی ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ ہمارا Eldorado تھا لیکن وہاں کوئی پاکستانی نہیں۔ ہر طرف صرف بنگالی ہی بنگالی گھومتے پھر رہے ہیں''

1971 کی جنگ میں بہاریوں نے پاکستانی فوج کا ساتھ دیا اور انہیں بھی بنگالیوں کی نسل کشی، لوٹ مار، اجتماعی زیادتیوں اور گھیراؤ جلاؤ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ بلاشبہ حکمران اشرافیہ کی یہ

MashalBooks.org

روایت تھی کہ وہ اکثریتی آبادی کے محروم طبقے کو اقلیتی محروم طبقے کے خلاف استعمال کرتی تھی۔ بہاری معاشرے کا غریب ترین طبقہ تھے اور 1971 میں انہیں بنگالی قوم پرستوں اور انڈو بنگلہ فورسز کے خلاف فرنٹ لائن کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پھر آزادی کے بعد بہاریوں نے انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی اور بنگلہ دیشی حکومت کے زیر انتظام کیمپوں میں پناہ لے لی۔ 1973 میں انہیں موقع دیا گیا کہ وہ بنگلہ دیش یا پاکستان میں سے کسی ایک ملک کی شہریت کا انتخاب کریں جس پر 7 لاکھ 80 ہزار بہاریوں جن میں اکثریت متوسط طبقے کی تھی نے بنگلہ دیشی شہریت کا انتخاب کرلیا۔ وہ اکثریتی کمیونٹی میں ضم ہوگئے اور اپنی زبان اور شناخت سے محروم ہوگئے۔ 2 لاکھ 60 ہزار نے بدستور پاکستانی حیثیت کو ترجیح دی۔ 13 ہزار 325 بہاریوں کو پاکستان واپس لاکر صوبہ پنجاب میں ٹھہرایا گیا۔ پاکستان میں مہاجر سندھی کشمکش کے تناظر میں باقیماندہ بہاریوں کو اسی طرح بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ لاکھوں بنگلہ دیشیوں کے غیر قانونی طور پر پاکستان منتقل ہونے سے بہاریوں کی بے وطنی اور پاکستان میں قیام کے دعوؤں کے حوالے سے ریاستی ذمہ داریوں میں مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی۔

جہاں تک کیمپوں میں مقیم بہاریوں کا تعلق ہے تو 1997 میں دی ریفیوجی اینڈ مائیگریٹری موومنٹس ریسرچ یونٹ کے ڈھاکہ کے 2 بڑے کیمپوں میں کرائے گئے ایک سروے کے مطابق 59 فیصد بہاریوں نے خود کو بنگلہ دیشی قرار دیا۔ 62.4 فیصد نے مقامی حیثیت کا انتخاب کیا اور 55 فیصد نے کہا کہ وہ پاکستان نہیں جانا چاہتے۔ ان حقائق کے تناظر میں ان بے وطن افراد کی شہریت کے حقوق کا معاملہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ بہاریوں کی قانونی حیثیت کا تجزیہ کرتے ہوئے سلطانہ نہار نے اقوام متحدہ کے بے وطنی میں کمی کے کنونشن (1959) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بہاری بنگلہ دیشی شہریت کے حقدار ہیں۔ حتیٰ کہ سپریم کورٹ کے ہائیکورٹ ڈویژن نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ 1984 میں عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ''درخواست دہندہ (بہاری) کی طرف سے پاکستان جانے کیلئے درخواست دائر کرنے کا مطلب اس کا شہریت سے محروم ہونا نہیں ہے''۔ اسی طرح بہاریوں کی زمینیں اور املاک بھی اس وقت کی حکمران پارٹی کے عہدیداروں نے ہتھیالیں۔ 1972 کے صدارتی فرمان نمبر 16 کے تحت بہاریوں کی ملکیت جائیدادوں کو ''متروکہ املاک'' قرار دے دیا گیا اور ان پر ریاست کو نگران مقرر کردیا گیا۔ ضمنی

MashalBooks.org

آرڈیننس 1985 کے تحت جائیداد کے دعویدار کو ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ متروک نہیں۔ اگر متعلقہ بہاری بنگلہ دیش کی شہریت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنی ''متروک جائیداد'' کی ملکیت کا دعویٰ دائر کر سکتا ہے تاہم اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ بہاریوں کو شہریت کے حصول کیلئے کافی تردد کرنا پڑتا ہے۔

MashalBooks.org

پاکستان

روزمرہ معمولات میں عدم برداشت

پاکستان کی مذہبی اقلیتوں۔عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں، احمدیوں (اور خواتین) کو آئین کی توثیق کے حامل ایسے قانونی اور عدالتی نظام میں جبر کا سامنا ہے جو امتیازی سلوک، بیدخلی اور انتہا پسندی کے کلچر کی عکاسی کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے۔کل آبادی میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی 3.3 فیصد ہے (عیسائی 1.69، ہندو 1.4 فیصد اور دیگر ایک فیصد سے بھی کم)۔ممکن ہے کہ یہ سرکاری اعداد و شمار زمینی حقائق کے منافی ہوں۔اقلیتی گروہ اکثر خود کو چھپاتے ہیں۔ہندو اپنا نام مسلمانوں جیسا رکھ سکتے ہیں اور اپنی شناخت برادری کے حوالے سے کرتے ہیں۔

''طویل عرصے سے پائے جانے والے اس ابہام کہ پاکستان'' مسلمانوں کیلئے سرزمین'' ہے یا ''اسلامی ریاست ہے'' نے مذہبی اقلیتوں کے معاملے میں غیر یقینی صورتحال پیدا کی ہے۔یہ بات ضروری ہے کہ امتیازی سلوک کا مشاہدہ کیا جائے کیونکہ یہ روزمرہ کا معمول ہے۔اس کے علاوہ قانونی فریم ورکس کا بھی تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔اگرچہ آئین میں امتیازی سلوک کا عنصر ملنا ضروری نہیں تاہم روزمرہ کے معمولات میں عدم برداشت بہم نظر آتا ہے۔حتیٰ کہ توہین مذہب قانون جو بلا روک ٹوک اقلیتوں کو ہدف بناتا ہے کو سرکاری طور پر موت کی سزا کی منظوری کیلئے استعمال نہیں کیا گیا۔اگر ہر دفعہ نہیں تو اکثر و بیشتر توہین مذہب کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔اکثریتی گروپ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور سماجی اتفاق رائے سے ''ملزم'' پارٹی کو مار دیا جاتا ہے''

MashalBooks.org

جنرل پرویز مشرف نے اکتوبر 1999 میں اقتدار سنبھالنے کے بعد کہا تھا کہ: ''میں پاکستانی اقلیتوں کو یقین دلانا چاہوں گا کہ انہیں اسلام کی حقیقی روح کے مطابق ہر قسم کا تحفظ اور حقوق حاصل ہوں گے'' لیکن پاکستان میں بطور اقلیت رہنے کا مطلب نہ صرف آئین کی بنیاد پر امتیازی سلوک کا شکار ہونا ہے بلکہ اسے عدم برداشت کے معاشرتی کلچر کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ سرکاری سطح پر محدود شراکت اور محدود سماجی معاشی حقوق کے باعث اقلیتی گروہ پسے ہوئے اور محروم شہری بن چکے ہیں۔ غربت کے باعث اقلیتی گروپ کا فرد عدم تحفظ اور لاتعلقی محسوس کرتا ہے۔

سرکاری شعبے میں محدود شمولیت

سرکاری شعبے میں اقلیتوں کی نمائندگی برائے نام یا نمائشی ہے۔ موجودہ پارلیمنٹ میں صرف 3 ارکان ہندو ہیں اور سپریم کورٹ میں (کتاب کی اشاعت کے وقت) صرف ایک ہندو جسٹس بھگوان داس ہیں جو چیف جسٹس کے بعد سنیئر ترین جج ہیں البتہ عام طور پر اتنے اعلیٰ مناصب پر چند اقلیتی افراد ہی پہنچتے ہیں۔ یعنی سول سروس، عدلیہ، سیاسی جماعتیں اور ہاں مسلح افواج میں۔

جداگانہ طرز انتخاب

پاکستان میں اقلیتوں نے کبھی جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ جب جنرل ضیاالحق نے 1985 میں جداگانہ طریقہ انتخاب متعارف کرایا تو اس کی مخالفت کی۔ ضیاالحق نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ووٹ الگ الگ کر دیے تھے۔ صدارتی فرمان میں کہا گیا کہ اقلیتوں کے الگ حلقے اور نمائندے ہوں گے۔ اس فیصلے سے اقلیتوں کیلئے سیاسی جماعتوں میں کوئی دلچسپی نہ رہ گئی۔ اس سے پہلے اقلیتوں اور خواتین کی مخصوص نشستیں تھیں۔ جمہوری طور پر منتخب ہونے والی نواز شریف اور بے نظیر کی حکومتوں نے بھی جداگانہ طرز انتخاب ختم کرنے سے گریز کیا۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں دانشوروں نے اس کے خلاف مہم چلائی۔ قومی کمیشن برائے امن وانصاف (2005) پاکستان نے درج ذیل اعتراضات اٹھائے۔

1- جداگانہ طرز انتخاب سے مذہبی تعصب کو شہ ملتی ہے اور قوم کے اندر انتشار پھیلتا ہے۔
2- اقلیتیں سیاست کے قومی دھارے سے الگ ہو جاتی ہیں۔

MashalBooks.org

3- اقلیتیں تیسرے درجہ کی شہری بن کر رہ جاتی ہیں۔

4- جداگانہ طرز انتخاب کمیونٹی کی بجائے فرد کی بہتری کا باعث بنتا ہے۔

5- اس سے اقلیتیں مزید تقسیم اور مقہور ہوتی ہیں جس سے باہمی نفاق اور اختلاف جنم لیتا ہے۔

بالآخر امریکہ کے دباؤ پر مشرف نے اصلاحات کرتے ہوئے اوائل جنوری 2002 میں جداگانہ طرز انتخاب ختم کر دیا۔ چنانچہ اکتوبر 2002 کے انتخابات مشترکہ طرز انتخاب کے تحت منعقد ہوئے۔

امتیازی حلف اور انتخابی طریقے

ایسے قواعد سے مخصوص کمیونٹی کو نظام سے الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر احمدیوں کو آزاد کشمیر میں الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں کیونکہ احمدیوں کو ختم نبوت کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور نتیجتاً وہ جمہوری حق سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر:

آزاد کشمیر کے آئین کے مطابق جو پاکستان نے 1974 میں نافذ کیا تھا۔ انتخابی امیدواروں کی پیشگی جانچ پڑتال کی جاتی ہے کہ کیا وہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ہیں یا نہیں۔ کشمیر کو آزاد خطہ بنانے والوں کا راستہ روکنے کیلئے آزاد کشمیر کے آئین کا انتخابی قانون ایسے امیدوار کو الیکشن لڑنے کا نااہل قرار دے دیتا ہے جو:

''وہ شخص نظریہ پاکستان کے خلاف کسی بھی قسم کے پراپیگنڈے میں ملوث رہا ہو یا ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے نظریے یا پاکستان کی سلامتی یا آزاد کشمیر یا پاکستان کے تحفظ کے خلاف ہو یا اخلاقیات یا امن عامہ یا آزاد کشمیر اور پاکستان کی عدلیہ کی یکجہتی یا آزادی کے خلاف ہو'' (ہیومن رائٹس واچ 2006)۔

شمالی علاقہ جات:

شمالی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے سیاسی حقوق کے کارکنوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی آبادی عملاً پاکستان سے الگ تھلگ ہے۔ وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے لئے ارکان منتخب کر کے نہیں بھیج سکتے۔ پاکستان دعویٰ کرتا ہے کہ شمالی علاقہ جات کو اسلام آباد کی انتظامی حمایت کے ساتھ مقامی

اتھارٹی کے تحت چلایا جاتا ہے۔ سیاسی حقوق کے کارکن خودمختاری کے اس دعوے کو چیلنج کرتے ہیں اور ان کا مؤقف ہے کہ اختیارات کا اصل منبع وزیر امور آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات ہوتا ہے۔

سماجی اور معاشی حقوق کی نفی

پاکستان کی غیر مسلم برادریوں کی سماجی معاشی بیدخلی روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ ان کی پست سماجی معاشی حیثیت ہی ان کے اقلیتی کمیونٹی سے تعلق رکھنے کی علامت ہوتی ہے۔ عیسائیوں کی اکثریت پنجاب میں جبکہ ہندوؤں کی زیادہ آبادی دیہی سندھ میں مقیم ہے اور یہ لوگ پاکستان کی معاشی لحاظ سے پسماندہ ترین آبادی ہیں۔ تعصب کا مظاہرہ درسی کتب اور نصاب سے ہوتا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں عیسائیوں اور ہندوؤں کو اکثر و بیشتر ناقابل اعتبار، اخلاقی طور پر کمزور اور اسلام کے دشمن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

عیسائیوں کے پسماندہ سماجی رتبے اور ان کے مذہبی عقیدے کیلئے عدم احترام کے باعث انہیں وسیع پیمانے پر بدسلوکی اور ہراساں کرنے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امتیازی سلوک اور تعلیمی پسماندگی دونوں مل کر عیسائی مردوں کی بے روزگاری کی شرح میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کسی بھی جگہ پر ملازمت کیلئے مسلمان آجر انہیں کم ترجیح دیتے ہیں۔ نومبر 1999 میں ریاض مسیح جو ایک کسان تھا کو اس کے زمیندار نے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرنے پر تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ملزم کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ خالد احمد نے پاکستانی اقلیتوں پر اپنے ایک جائزے (1999) میں کہا ہے کہ ''عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد جو قالین بافی کی گھریلو صنعت میں کام کر رہی ہے۔ درحقیقت جبری مشقت کر رہی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مسیحی کسانوں کے پیشگی قرضہ جات کے پیچیدہ نظام کے تحت پورا خاندان مقروض ہو جاتا ہے اور بچے بھی مالک کو ادائیگی یعنی مشقت کرنے کے پابند ہوتے ہیں''۔

سندھ میں بالخصوص بھیل اور کوہلی ہندوؤں کی جبری مشقت کا واقعہ زیادہ بدنام ہے۔ وڈیروں نے ہزاروں ہندو مزدوروں کو ان کے آباؤ اجداد کو دیے گئے قرضوں کی بنا پر محصور کر رکھا ہے۔ انہیں فارم یا کھیت سے واپس گھر جانے کی اجازت نہیں اور انہیں گزر بسر کیلئے راشن دیا جاتا ہے جبکہ ان کی عورتیں وڈیرے اپنی رکھیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان ہاریوں کی صورتحال

MashalBooks.org

اس وقت بے نقاب ہوئی جب ہزاروں ہاریوں نے حیدر آباد کے ایک چرچ میں پناہ لے لی۔ انتظامیہ کو مجبوراً ان کی حمایت کرنا پڑی کیونکہ جبری مشقت پاکستان میں قانوناً ممنوع ہے اور سود پر پیسہ دینا بھی۔ آخر کار جاگیرداروں نے اپنی سیاسی طاقت استعمال کی اور کئی ہندوؤں کو جبراً واپس لے گئے۔ سندھ میں ہندو نہایت خوف اور عدم تحفظ کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ بھارت میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا خمیازہ انہیں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے مئی 2005 میں ہندوؤں کی عبادتگاہوں پر حملوں کے حوالے سے تحقیقاتی رپورٹ جاری کی۔ میگھوار ہندو فیملی نے شکایت کی کہ انہیں سندھ کے وزیر اعلیٰ ارباب غلام رحیم کے قریبی لوگوں کی طرف سے تشدد اور ہراساں کرنے کا سامنا ہے۔ کمیشن کے رکن جام ساقی کی سربراہی میں حقائق جاننے والی ٹیم نے وزیر اعلیٰ کے آبائی گاؤں کھیت لاڑی کا دورہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں مقیم ہندوؤں کی بڑی تعداد وزیر اعلیٰ اور انکے حواریوں سے خوفزدہ ہے۔ اس کے علاوہ ارباب رحیم کے رشتہ دار ایک سکھ اُتم سنگھ کے اغوا میں بھی ملوث تھے۔ یہ حقائق منظر عام پر لانے کے بعد جام ساقی اور انکی اہلیہ کو سندھ حکومت کے حکام کی طرف سے ہراساں کیا گیا اور ساقی کو اغوا کے الزامات میں دھر لیا گیا۔

جبری تبدیلی مذہب بھی عام ہے۔ مارچ 2003 میں 13 خواتین سمیت 30 ہندوؤں نے شکر گڑھ کے عالم کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا۔ ایسے ان گنت واقعات بھی ہوئے کہ ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے جبری تبدیلی مذہب کے بعد شادی کر لی گئی۔ یوں انہیں لاچارگی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اسی تناظر میں نیلم لڈھانی کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔

احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا اور کئی مسلمان انہیں بدعتی سمجھتے ہیں۔ ان کا دیہات میں کھلے عام سماجی اور معاشی بائیکاٹ کیا جاتا ہے جبکہ حکومت لاتعلق نظر آتی ہے۔ کئی دیہات میں جہاں احمدی چھوٹی اقلیت میں ہیں وہاں احمدیوں کو ملازمتوں اور آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انہیں ایسی جگہوں پر منتقل ہونے کیلئے مجبور کر دیا گیا جہاں وہ اپنی گزر بسر با آسانی کر سکتے ہوں۔ جتوئی ضلع مظفر گڑھ کے ایک احمدی استاد مشتاق احمد کو 2000 میں مکمل بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے بچوں کو گاؤں کے مشترکہ تالاب سے پانی پینے کی اجازت نہیں تھی۔ محکمہ تعلیم نے ان کے خلاف محکمانہ انکوائری شروع کر دی اور بالآخر ان کا تبادلہ کسی اور گاؤں میں کر دیا گیا جہاں ان کا استقبال

مظاہروں اور موت کی دھمکیوں سے کیا گیا۔کئی علاقوں میں دکاندار احمدیوں کو سودا سلف نہیں فروخت کرتے۔کئی مزدور بعض اوقات احمدیوں کیلئے کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔احمدی صحافیوں کو مجرمانہ الزامات کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی تحریروں کو کافرانہ سمجھا جاتا ہے۔کئی صحافیوں کے خلاف درجنوں مقدمات زیرالتوا ہیں۔

مذہبی حقوق سے انکار

پاکستان میں مذہبی اقلیتوں بالخصوص عیسائیوں اور احمدیوں کو ان کے عقیدے پر چلنے اور تبلیغ کرنے کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔اگر نجی افراد کی طرف سے انہیں نشانہ بنایا جائے تو سرکاری حکام انہیں ضروری تحفظ فراہم نہیں کرتے۔انسانی حقوق کے گروپوں کو احمدیوں اور مسیحیوں کی درجنوں عبادتگاہوں کو تباہ کرنے یا ان کی بے حرمتی کی رپورٹیں ملی ہیں۔بیشتر واقعات متعلقہ مقامی حکام کی نظروں کے سامنے رونما ہوئے۔عیسائیوں اور احمدیوں کو ان کی اپنی ہی زمینوں پر عبادتگاہیں بنانے سے روک دیا جاتا ہے۔احمدیوں کی مساجد اور رہائشگاہوں کی خصوصی تزئین بالخصوص جہاں کلمہ طیبہ لکھا ہو وہ احمدیوں اور ان کے مخالفین میں زیادہ تنازعے کا باعث بنتی ہے۔

11 جنوری 2001 کو جیکب آباد میں 2 مسیحی خالد مسیح اور ناصر مسیح گرفتار ہوئے۔ان کے ساتھ 100 مسیحی خاندان جن کی اکثریت غریب افراد کی تھی بھی پکڑے گئے۔الزام یہ تھا کہ انہوں نے مذہبی پمفلٹ تقسیم کئے ہیں۔اکثر اوقات احمدیوں کو مذہبی اجتماعات منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔پنجاب حکومت نے احمدیوں کو گزشتہ ایک دہائی سے ربوہ شہر میں ان کے مرکز میں اجتماع کی اجازت نہیں دی۔اس کے برعکس احمدی مخالف گروپوں کو ربوہ میں جلسوں کی اجازت ہے۔جن کے دوران ربوہ میں احمدیوں کی 95 فیصد آبادی ہونے کے باوجود ان کے خلاف نعرے لگانا معمول ہے۔احمدی مخالف تنظیم ختم نبوت کو پنجاب حکومت نے 12 اور 13 اکتوبر 2000 کو ربوہ میں سالانہ کانفرنس کی اجازت دی جہاں مقررین نے احمدیوں کا قلع قمع کرنے کا مطالبہ کیا۔اس کے بعد کانفرنس میں شریک طلبا نے مظاہرہ کیا اور احمدیوں کے خلاف نعرے بازی کی۔پولیس ان کی معیت میں تھی۔ختم نبوت کی بعض کانفرنسوں میں سرکاری حکام بھی موجود تھے۔

MashalBooks.org

فوجداری نظام انصاف اور اقلیتیں:

پاکستان کے آئین کے تحت تمام شہریوں کو قانون میں یکساں حقوق حاصل ہیں تاہم پولیس اور عدلیہ کے کچھ حصے نے اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے مناسب تحفظ یا ان کی قانونی امداد کی ذمہ داریوں سے بظاہر پہلوتہی کی ہے۔جن احمدیوں کو دھمکایا یا نشانہ بنایا جاتا ہے ان کی شکایات پر پولیس ایکشن لینے میں تامل کا مظاہرہ کرتی ہے۔اس کے برعکس ان کے خلاف شکایات پر فوراً کیس درج کرلیا جاتا ہے۔26 اگست 1998 کو سندھ کے ضلع میر پور خاص کے علاقے نوکوٹ میں سینکڑوں مسلح افراد نے مقامی علما کی زیر قیادت ایک احمدی مسجد پر حملہ کردیا۔کارروائی میں کئی احمدی زخمی ہوئے اور انکی مذہبی کتابوں اور مسجد سے ملحقہ احمدیوں کی دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ چند روز پہلے 22 اگست کو جب احمدی پرانی مسجد مسمار کر کے نئی مسجد تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے تو قدامت پسند مسلمانوں نے اس پر اعتراض کردیا۔احمدیوں کی درخواست پر پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کردیا۔

اس کے برعکس پولیس نے احمدیوں کے خلاف 2 شکایات درج کیں۔5 احمدیوں (جن میں 14 سالہ نذیر احمد بلوچ بھی شامل تھا) کے خلاف دفعہ 295 اے اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ 295 بی کے تحت۔دوسرا کیس نوکوٹ میں کلمہ طیبہ آویزاں کرنے پر 14 احمدیوں کے خلاف انہی دفعات کے تحت درج کیا گیا۔تمام 15 احمدی گرفتار کر لئے گئے اور انہیں ٹرائل کے بغیر حراست میں رکھا گیا۔اس واقعے کے 2 ہفتے بعد احمدیوں پر حملہ کرنے والوں کے خلاف اس وقت مقدمہ درج کیا گیا جب سندھ ہائیکورٹ نے مداخلت کی البتہ کسی کی بھی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔

پولیس اور عدلیہ کی طرف سے زیادہ فریب کن اقدام ایف آئی آر میں دفعہ 295 اے شامل کرنا ہوتا ہے۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997 کے تحت خصوصی عدالت میں چلایا جائے گا۔ یہ عدالتیں فرقہ وارانہ تشدد سے نمٹنے اور مقدمات کی تیز رفتار سماعت کیلئے بنائی گئی تھیں۔البتہ ان عدالتوں کے تیز رفتار طریقہ کار کے باعث ملزموں کو دفاع کا بھرپور موقع ملتا ہے اور عموماً ان کی ضمانت بھی منظور نہیں کی جاتی۔اعلیٰ عدلیہ کے ایک حصے میں بھی اقلیتوں کے خلاف تعصب کا عنصر پایا جاتا ہے۔لاہور ہائیکورٹ کے (سابق) جسٹس

MashalBooks.org

میاں نذیر اختر کے میڈیا میں یہ ریمارکس سامنے آئے کہ ''ہم پیغمبر اسلامؐ کے خلاف بولنے والی ہر زبان کاٹ ڈالیں گے''۔18 نومبر2000 کو ایک عوامی تقریب کے دوران جسٹس میاں نذیر اختر نے مبینہ طور کہا کہ ''توہین مذہب قانون ملزم کو تحفظ دیتا ہے بصورت دیگر مشتعل ہجوم اسے مار ڈالے۔اس کیس میں حکومت کی ہچکچاہٹ اور احتیاط کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ایک بھی ملزم کو سزا نہیں سنائی جاسکی''۔انہوں نے اس قانون کے ان ناقدین کو جو ترمیم کا مطالبہ کررہے ہیں کو''اسلام دشمن قوتوں کا ایجنٹ'' قرار دیا جو بقول ان کے اس قانون کو سمجھ ہی نہیں سکے۔

ضابطہ فوجداری میں دفعہ295اے کا اضافہ اکثر اوقات ظالمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا بظاہر جرم کی نوعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔تاہم وکلا کی طرف سے کیس سے یہ دفعہ نکلوانے میں مہینوں کا عرصہ لگ جاتا ہے جس دوران ملزم حراست میں ہی رہتا ہے۔ملزم ٹرائل سے پہلے کئی ماہ تک گرفتار رہتا ہے۔ضابطہ فوجداری کی دفعہ (22)196 کے تحت کوئی عدالت چاہے یہ عام عدالت ہو یا انسداد دہشت گردی کی عدالت ہو وہ قومی یا صوبائی حکومت کی طرف سے شکایت درج ہونے تک دفعہ295 اے کے تحت کارروائی نہیں کرسکتی۔احمدیوں کی دفعہ295 اے کے تحت وکالت کرنے والے وکلا اور ملزموں کا کہنا ہے کہ یہ قانونی تقاضہ اکثر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔اس دفعہ کے تحت مقدمے کا اندراج اکثر نجی افراد کی درخواست پر ہوجاتا ہے۔

عموماً مذہبی نوعیت کے مقدمات عام کیسوں کی بہ نسبت زیادہ دیر تک چلتے رہتے ہیں کیونکہ اکثر اوقات ججوں کو کمرہ عدالت میں اسلام پسندوں کی موجودگی سے خطرہ محسوس ہوتا ہے اور وہ کیس کی سماعت ملتوی کرتے چلے جاتے ہیں۔جج کم ہی مذہبی مقدمات اقلیتی برادری کے ملزموں کو ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔اس حقیقت کے باوجود کہ ضابطہ فوجداری (پاکستان پینل کوڈ) میں جھوٹے الزامات اور غلط شواہد پر سزائیں موجود ہیں۔اس کا اطلاق توہین مذہب کیس میں کم ہی کیا جاتا ہے۔مقامی این جی اوز کی طرف سے1986 سے اپریل2006 کے درمیان جمع کئے گئے اعداد وشمار کے مطابق695 افراد پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا۔ان میں سے362 مسلمان،239 احمدی،86 مسیحی اور10 ہندو تھے۔(امریکی دفتر خارجہ2006)۔

احمدی مسلمانوں کے خلاف قانونی کارروائیاں

پاکستان کی اکثریتی آبادی شیعہ یا سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضرت محمدؐ خدا کے آخری اور عظیم ترین پیغمبر ہیں اور حضرت عیسیٰ کا مستقبل میں کسی خاص وقت پر دوبارہ ظہور ہوگا۔ البتہ احمدی تحریک کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) مرزا غلام احمد قادیانی کو بطور مسیحا بھیجا ہے۔ جہاں احمدی خود کو اسلام کا حصہ قرار دیتے ہیں وہاں شیعہ اور سنی دونوں اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ احمدیوں کو کافر یا غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں احمدی کمیونٹی کے ایک کروڑ ارکان پائے جاتے ہیں۔

پاکستان نے احمدیوں کو قانوناً غیر مسلم قرار دے رکھا ہے۔ 1974 میں قومی اسمبلی نے آئین میں دوسری ترمیم کی منظوری دی۔ جس سے احمدی مسلمانوں کا بظاہر قلع قمع کرتے ہوئے انہیں دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ 1984 میں جنرل ضیا الحق نے مارشل لا آرڈیننس XX جاری کیا جس کے تحت خود مسلمان ظاہر کرنے والے احمدیوں کیلئے 3 سال سزا کی قید مقرر کی گئی۔

1993 میں کئی احمدیوں نے سپریم کورٹ کے روبرو رٹ دائر کی کہ احمدیوں کو آئین کے آرٹیکل 20 کے تحت حاصل مذہبی حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ یہ اپیل مسترد کر دی گئی اور عدالت نے قرار دیا کہ احمدیوں کو مساوی حقوق دینا امن عامہ کیلئے خطرناک ہوگا۔ جج صاحبان نے اپنے فیصلے میں کہا کہ شیعہ اور سنی مسلمانوں جن کی تعداد کہیں زیادہ ہے وہ احمدیوں کی تحریک کو ''نظریاتی طور پر جارحانہ'' سمجھتے ہیں۔ بنچ کے اکثریتی ارکان کی رائے کے مطابق کئی اسلامی تعلیمات اصل میں اسلامی عقیدے کی کاپی رائٹ ٹریڈ مارکس ہیں۔ اس لئے احمدیوں کی طرف سے ان تعلیمات کا استعمال کاپی رائٹ کی خلاف ورزی ہے جس سے ٹریڈ مارک ایکٹ 1940 کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ قادیانی فرقہ مخصوص اسلامی تعلیمات استعمال کر کے توہین مذہب کا مرتکب ہوا ہے۔

احمدیوں کو انتخابی نظام تک رسائی میں بھی امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ اگرچہ جنرل ضیا الحق نے جداگانہ طرز انتخاب متعارف کرایا جسے جنرل پرویز مشرف نے ختم کر دیا تھا تاہم مسلم اور غیر مسلم کی شناخت کا عملی مقصد بدستور موجود ہے۔ چیف الیکشن کمشنر جسٹس (ر) ارشاد حسن خان نے اعلان کیا کہ ایسے مسلمان جنہوں نے انتخابی فہرستوں میں اپنے نام کے اندراج کی

MashalBooks.org

درخواست جمع کرائی ہے کو اپنے مذہبی عقیدے اور ختم نبوت پر ایمان کا حلف نامہ بھی جمع کرانا پڑے گا۔ اس تناظر میں احمدیوں کا سیاسی مقام جوں کا توں رہے گا اور مشترکہ طرز انتخاب نافذ العمل ہونے کے باوجود احمدیوں کا نام الگ فہرست میں ہی رہے گا۔ اپنے عقیدے کے برخلاف حلف دینے سے انکار کر کے احمدی کمیونٹی عملاً انتخابی عمل میں غیر موثر ہو چکی ہے۔

اقلیتوں کو محروم اور مطعون کرنا

پاکستان کے سماجی ثقافتی رجحانات ایسے ہیں جنہوں نے منظم طور پر مذہبی اقلیتوں کو محروم اور مطعون کیا ہے۔ ہندو، عیسائی، پارسی، سکھ اور عقیدے کے لحاظ سے ''مکدر'' احمدی۔ سرکاری سطح پر تصوراتی قومی شناخت یہ ہے کہ پاکستان مسلمانوں کے وطن کا حامل ملک اور ایک قوم ہے۔ اس تصور میں وہ لوگ خلل انداز ہوتے ہیں جو اس سے ہم آہنگ نہیں۔ یک نسلی قوم پرست دیومالا کو مضبوط بنانے کیلئے ''دیگر'' کو بے دخل یا خاموش ہونا پڑے گا۔ ماہر عمرانیات روبینہ سہگل نے اس نظریے کو اپنے مضمون ''اجنبی گھر میں: پاکستانی درسی کتب میں اقلیتیں'' میں بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

''یہ اقلیتیں ہی ہیں جنہیں یہ قوم یا تو تسلیم ہی نہیں کرتی یا پھر ایسے ماضی کی یادگار کے طور پر ضمناً تسلیم کرتی ہے جسے قوم کی Purity کیلئے بھول جانا چاہیئے۔ انہیں قوم کے کئی ''دیگر'' سے ربط کی یادگار بھی سمجھا جاتا ہے۔ کئی افراد کے نزدیک یہ دراندازہیں جن کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ناخوشگوار ریمائنڈر ہیں کہ قوم اتنی پاکیزہ نہیں جتنا اسے ہونا چاہیئے۔ یہ کہ یہ ملغوبہ ہے۔ یہ کہ ''دیگر'' مذہبی، لسانی یا نسلی عناصر کا مجموعہ ہے جو بصورت دیگر ایک قوم کی غیر متزلزل شناخت کی داستان میں دخل اندازی ہے''

روبینہ سہگل آگے جا کر لکھتی ہیں کہ ''ان عناصر کو کنٹرول کرنے کا موثر ترین ہتھیار اور اہل اسلام کی سرزمین کے بارے میں قوم پرست تصورات اور دیومالاؤں کے تسلسل کو یقینی بنانے کیلئے ہر جگہ موجود درسی کتب کا سہارا لیا جاتا ہے''۔ پاکستان کی درسی کتابوں کے نظام پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے روبینہ سہگل نے ان عوامل کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جو اقلیتوں کو مطعون کرتے ہیں۔ مثلاً ایسے مضامین جن کا عنوان یہ ہے۔ ''پیدائشی شیطان ہندو''، چالباز اور دھوکے باز

MashalBooks.org

انگریز، کرپان بردار، قصاب سکھ، سودخور یہودی اور پیٹھ میں چھرا گھونپنے والا بنگالی۔

پیدائشی شیطان: ہندو دیگر

ہندو انیسویں صدی کے دوران کچھ زیادہ ہی منصوبہ ساز بن گئے۔ وہ انگریز حکمرانوں کو باہر نکالنے کے بعد مسلمانوں جنہیں وہ ملیچھ کہتے ہیں کا قلع قمع کر کے برصغیر کو ہندو ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہی اسی قسم کی نسل پرستی یا نسلی نفرت تھی جو قدیم آریا باشندے غیر آریاؤں کے بارے میں رکھتے تھے اور غیر آریاؤں کو ''سیاہ بھوتنے'' کہتے تھے۔ بالکل امریکی یا یورپی باشندوں کی طرح جو سفید فام باشندے نہ ہونے والے افراد کو ''gooks'' وغیرہ بولتے تھے۔ (مظہر الحق 2000)

چالباز اور دمکار ترین: عیسائی دیگر

افریقہ کے باشندوں نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ انہیں عیسائی حکمرانوں کے استبداد سے بچانے کیلئے حملہ کریں کیونکہ ان کے حکمران ان سے جبراً ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

یروشلم جانے والے کئی عیسائی زائرین نے اپنے مصائب کی کئی جعلی کہانیاں گھڑیں۔ اگر انہیں راستے میں لوٹ لیا جاتا تو وہ کہتے کہ انہیں لوٹنے والے مسلمان تھے۔ (معاشرتی علوم درسی کتب، جماعت ششم)۔

سری لنکا اور پاکستان: خطرے سے دوچار گروہ

سری لنکا کے اصل باشندں کو باہر سے آنے والے ویدھا (شکاری) یا ونیالہ آیٹو (جنگلی) کہتے ہیں۔ یہ لوگ تعداد میں انتہائی کم ہیں۔ 1930 اور 1940 کے عشرے میں پولونا روا اور ماہی ینگانا خطوں میں بڑے پیمانے پر آبادکاری اور زراعت میں توسیع کے باعث انہیں نقل مکانی کرنا پڑی۔ ونیالہ آیٹو لوگوں کی جنگلی زمین اس وقت مزید سکڑ گئی جب 1950 کے عشرے میں Gal oya سکیم کی منظوری دی گئی۔ اس وقت ایک ویدھا ویلفیئر کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا مقصد ونیالہ آیٹو Wanniyala-Aetto افراد کو جدید سہولتوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔

اصل باشندوں سے بدسلوکی

مبانا میں آدی واسی (اصل) کمیونٹی کے ایک رکن ''یوکیکولا رتنا یانکے'' کو پولیس نے

غیر قانونی طور پر حراست میں لے لیا اور ماہی ینگانا پولیس نے اس پر یہ جھوٹا الزام لگایا کہ اس نے پولیس سے اپنی مادری زبان میں پوچھ گچھ کرنے پر اصرار کیا تھا۔ سری لنکا میں کئی اقلیتی آبادیاں سنہالہ زبان نہیں بول سکتیں جو شمالی سری لنکا کے سوا پورے ملک کی سرکاری زبان ہے۔ ڈھائی سال سے زائد عرصے تک عدالتوں کے پھیرے لگانے کے بعد ''یوکیکولا رتنا یائکے'' کو جولائی 2006 میں الزامات سے بری کر دیا گیا۔ البتہ پولیس کے خلاف کوئی انضباطی کارروائی نہ کی گئی۔

واقعے کا آغاز 26 دسمبر 2003 کو ہوا جب ''یوکیکولا رتنا یائکے'' کو پولیس نے تھانے میں حاضر ہونے کا پیغام بھجوایا کیونکہ گاؤں کے ڈاکیے نے اس کے خلاف شکایت درج کرائی تھی۔ ڈاکیے کو اس بات کا غصہ تھا کہ میڈیا میں یہ خبر سامنے آئی کہ ڈاکیے نے آدی واسی کمیونٹی کے نام پر ایک خط غیر قانونی طور پر کھولا تھا جس میں آدی واسیوں کیلئے امداد کی تفصیل درج تھی۔ ڈاکیے کو شبہ تھا کہ میڈیا کو یہ خبر ''رتنا یائکے'' نے پہنچائی تھی۔

رتنا یاء کے پولیس سٹیشن پہنچا تو اس نے روایتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے کندھے پر روایتی کپڑا تھا۔ جب پولیس نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو اس نے اصرار کیا کہ سوالات اس کی مادری زبان میں کیے جائیں جو پولیس کو نہیں آتی تھی۔ جب رتنا یائکے سنہالہ زبان بولنے میں ناکام ہو گیا تو تھانے کے انچارج نے اسے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا۔ 1970 کے عشرے کے وسط میں بڑے پیمانے پر آبپاشی کے منصوبے مہاولی پراجیکٹ کی تعمیر کے بعد بڑی تعداد میں اصل باشندے اپنی روایتی زمینوں سے محروم ہو گئے۔ بڑے رقبے پر جنگلات کاٹ دیے گئے۔ ونیالہ آیٹو کی روایتی 11 ہزار ہیکٹر پر مشتمل اراضی کا صفایا کر دیا گیا اور ہزاروں سنہالی اور تامل باشندے وہاں آباد ہو گئے۔

1983 وہ جنگل جہاں ونیالہ آیٹو باشندے رہتے تھے مادوروا ویا نیشنل پارک کا حصہ قرار دے دیا گیا اور انہیں وہاں مزید قیام کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں جنگل میں شکار کرنے یا لکڑیاں جمع کرنے تک بھی رسائی نہیں دی گئی۔ کچھ اصل باشندوں نے یہ پابندی توڑنے کی جرات کی جس پر جانی نقصان بھی ہوا۔ انہیں جنگل سے باہر بفرزون میں آباد کیے گئے دیہات میں قیام پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ چاولوں کی کاشت والے علاقے تھے جن سے ونیالہ آیٹو لوگوں کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ یوں ان کی خوراک اور صحت پر مضر اثرات مرتب ہوئے۔

MashalBooks.org

دسمبر1997 میں ونیالہ آیٹو لوگوں کی جبری نقل مکانی کے اثرات کا جائزہ لینے کے بعد سری لنکا کے صدر نے ان کی جنگلوں کو واپسی کے منصوبے کا اعلان کیا۔ واپسی کی شرائط اور طریقہ کار طے کرنے کیلئے فریقین کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ان میں نیشنل پارک کے انتظامی معاملات میں مقامی باشندوں کی شمولیت بھی شامل تھی تاہم اب تک کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوسکی۔ ونیالہ آیٹو باشندے مسلسل ملکی اور بین الاقوامی حمایت کا مطالبہ کررہے ہیں تاکہ ان کی اصل علاقوں کو واپسی کے1998 کے حکومتی منصوبے پر عملدرآمد کیا جاسکے۔ آج یہ لوگ نابود ہونے کے دہانے پر کھڑے ہیں اور بہبود عامہ پر زندہ رہ رہے ہیں۔

MashalBooks.org

پاکستان

اسلام کے فروغ کیلئے ریاست کے قومی نظریے نے ایک ایسا سرکاری کلچر پیدا کیا ہے جہاں پاکستان کے مذہبی، لسانی اور سماجی ثقافتی تنوع کیلئے بحیثیت مجموعی کم ہی احترام پایا جاتا ہے۔ اس صورتحال سے بالخصوص ملک کی چھوٹی اور مقامی آبادی کیلئے خطرناک نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ پاکستان سرکاری طور پر کسی اصل آبادی کی موجودگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے وہاں مردم شماری کا کوئی الگ نظام بھی موجود نہیں، پاکستان کے قدیم باشندوں کی تعداد کی کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

دیگر ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی کمرشل تعمیرات، بڑے ڈیموں کی تعمیر اور کارپوریٹ زراعتی فارمنگ سے قبائلیوں اور اصل باشندوں کیلئے خطرات کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ حکومت نے آبی ذخائر کے فروغ کیلئے منصوبے شروع کرتے ہوئے کوہلی، جھابلی، مورس اور موہانا باشندوں پر ان کے منفی سماجی اور ماحولیاتی اثرات کا اندازہ نہیں لگایا۔ بے زبان اور پالیسی سازی کے عمل سے دور یہ باشندے آئینی طور پر تسلیم شدہ شناخت سے محروم ہیں۔ کہالی اور مورس جیسے باشندے اپنے قدرتی وسائل پر حق سے محروم کر دیے گئے ہیں اور نابود ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

کوہلی باشندے بالائی سندھ کے دریائی علاقے میں مقیم ہیں۔ اپنی روایتی زمینوں اور ذرائع معاش سے محروم ہونے سے ان کی شناخت کو خطرہ لاحق ہے۔ کچھ علاقوں میں کوہلی اور مورس باشندوں کو نچلی ذات کے غیر مسلم سمجھا جاتا ہے۔ انکی اکثریت اب بھی ماہی گیری اور ٹوکریاں بنا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جوان کا روایتی ذریعہ معاش ہے۔ وہ موسم آنے پر کھیتوں میں مزدوری بھی کرتے ہیں۔ کچھ باشندوں نے یہ سرگرمیاں ترک کر کے دریا کے نزدیک کھیتی باڑی

MashalBooks.org

شروع کر دی ہے۔

پاکستان واٹر ویژن 2025 کے تحت پانی کے ذخائر کی تعمیر اور آبپاشی نے کئی منصوبے شروع کرنے کا پلان بنایا گیا ہے جس میں اصل باشندوں کی بقا کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ پراجیکٹ غربت میں عبوری کمی کے منصوبے کا لازمی جزو ہے لیکن اس میں مقامی باشندوں پر مضر اثرات یا ان کے ازالے کیلئے کوئی اقدامات تجویز نہیں کئے گئے۔ اسی طرح حال ہی میں پاکستان واٹر سیکٹر سٹریٹجی اور مسودہ نیشنل واٹر پالیسی میں بھی قبائلی اور اصل باشندوں پر کم توجہ دی گئی ہے۔ واحد استثنیٰ نیشنل ری سیٹلمنٹ پالیسی ہے جس میں مقامی افراد اور کسی حد تک انہیں تسلیم کرنے کا ذکر ہے۔ البتہ اس میں بھی بڑے آبی ذخائر کی تعمیر سے مقامی افراد پر مرتب ہونے والے اثرات کا ذکر نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے بھی ترقی کے اس عمل سے مقامی افراد پر اثرات سے پہلو تہی کی۔

MashalBooks.org